

اس کو دینی پر بھی یک گونہ ذوقیت ہے لیکن لکھنؤ کے شہری دادنی کار ناموں کی طرح اس کی لسانی خدمات کی جانب زیادہ اکتانہ نہیں کیا گیا ہے، اس لئے اس کتاب میں اس کی لسانی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، تمہید، تعارف، تبصرہ، پہلے حصہ میں بظور پس منظر زبان کی تشوید نما اور بعد بعد ارتقاء پر مختصر گفتگو ہے، دوسرے میں زبان و بیان، رد زمرہ و محاورہ، صرف و نحو، و قوافی و قواعد اور لغات و امثال کی ترتیب و تدوین میں حصہ لینے والے اٹھائیس لکھنوی مصنفین کا تذکرہ ہے اس میں پہلے ان مصنفین کے مختصر حالات و کمالات اور آخر میں لسانی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، یہ حصہ انشاد و ناسخ سے شروع ہو کر احتشام حسین مرحوم اور مسعود حسین خان (دائیں چانسٹر جامہ ملیہ) پر ختم ہوا ہے، درمیان میں مظفر علی اسیر، قادر بلگرامی، امیر مینائی، جلال، مرزا محمد ہادی رسوا، نظم طباطبائی، جلیل مانگ پوری، مرزا محمد عسکری، حسرت موہانی، نیاز فتحپوری، اثر لکھنوی اور مسعود حسن ادیب وغیرہ ارباب کمال اور مشاہیر زبان و ادب کا تذکرہ ہے، اس حصہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان میں بعض کا اصل وطن لکھنؤ نہیں ہے، تاہم یا تو وہ اس کے مضافات کے تھے یا ان کی عمر کا زیادہ حصہ یہیں بسر ہوا تھا، تیسرے حصہ میں لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھنؤ کی خدمات پر اجمالی تبصرہ ہے، یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور اس سے لکھنؤ کی لسانی خدمات کا مختصر خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے، مگر مختصر ہونے کی وجہ سے تشنگی باقی رہتی ہے، تعجب ہے کہ ناخذ میں شعرا الہند کا ذکر نہیں ہے، اس میں لکھنؤ خصوصاً ناسخ کی اصلاح زبان کا مفصل ذکر ہے، اسکے علاوہ مولانا عبدالسلام نے "دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا اثر دوسرے پر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو مقالات عبدالسلام میں شامل ہے، اس سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا جاسکتا تھا۔

جلد ۱۱ ماہ فروری ۱۹۷۶ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۳۹۶ھ عدد ۲

مضامین

شہزادت

سید صباح الدین عبدالرحمن ۸۲-۸۳

مقالات

اقبال، اسلام اور اشتراکیت،

جناب گلشن ناتھ آزاد صاحب ۸۵-۱۰۶

پاکستان میں چار بیٹے،

سید صباح الدین عبدالرحمن ۱۰۶-۱۱۸

علم الاخلاق اور فارسی نثر کی اخلاقی کتابیں،

ڈاکٹر محمد شرف عالم صاحب لکچرار ۱۱۹-۱۲۰

بی۔ این کالج پٹنہ،

سلطنت منلیہ کے آخری عہد کا ایک شاعر

ڈاکٹر علامہ مجتبیٰ انصاری صاحب ۱۳۱-۱۵۱

(نواب حکیم الممالک شیخ حسین شہرست)

استاذ شعبہ فارسی، بی۔ این بی کالج

(بھانچپور)

شیخ مبارک کی تفسیر کا قلمی نسخہ،

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی لکچرر شعبہ اسلامیات ۱۵۳-۱۵۶

مسلم ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ،

مطبوعات جدیدہ

۱۵۷-۱۶۰

رض

شعرا عجم حصہ اول

اس میں امیر خسرو دہلوی کے مفصل دسواں حالات کے ساتھ ان کی شاعری کی خصوصیات کو بھی بہت

تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مولفہ مولانا شبلی

قیمت: ۷۵-۸۰

"منہجہ"

شذرت

۲۳، ۲۴، ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو ہماری مرکزی حکومت کی طرف سے دہلی میں امیر خسرو کے سات ننو شاہنشاہ کلایک بین الاقوامی سمینار میں راقم بھی مدعو تھا، امریکہ روس، مہر شام، ترکی، افغانستان، ایران اور بنگلہ دیش کے نمائندے بھی آئے ہوئے تھے، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کی بھی نمائندگی تھی، جہون اور کشمیر کے ذریعے شیخ عبداللہ صاحب اس کے خصوصی مہمان تھے،

جشن کا افتتاح جناب فرزانہ بی بی احمد صاحبہ صدر جمہوریہ ہند نے اپنے باوقار خطبہ سے کیا جس میں اعلان کیا کہ امیر خسرو کے مولد پٹیالی کا نام اب خسرو مگر رکھ دیا گیا ہے، ان کا خیر مقدم حکومت ہند کے وزیر تعلیم جناب نور الحسن صاحب نے کیا، مگر پورے جشن کے اصلی روح رواں اس جشن کے صدر نواب علی یاور جنگ گورنر مہی تھے، ان کو ہونا بھی چاہیے تھا، کیونکہ امیر خسرو سلطنت دہلی کے عماد الملک کے نواسے تھے، تو وہ بھی آصفیہ سلطنت کے عماد الملک کے نواسے ہیں، انھوں نے سمینار کے آغاز میں کچھ سخت رویہ ضرور اختیار کیا لیکن بقیہ در تمام اوقات کی کارروائی میں اپنی علم شناسی، مکتہ پروری اور ذہلہ سنجی سے ایک خوشگوار فضا پیدا کرتے رہے، اس کی کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر پر ہوا اور دوسرے کاموں میں ان کی اعانت جناب یونس سلیم صاحب نے کی جو اس جشن کے آج صدر تھے، پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی (صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی)، حسن الدین صاحب (محکمہ اطلاعات آسٹریلیا حکومت ہند) اور ڈاکٹر نور الحسن (شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی) اپنے اور دوسرے رفقاء کے ساتھ مہمانوں کی خاطر تواضع میں سرگرم تھے،

جشن کے نمائندوں کو انگریزی میں "لائف ٹائمس اینڈ کرس آف امیر خسرو" پیش کی گئی، جس کو نواب علی یاور جنگ کی سرپرستی میں ڈاکٹر طاہر انصاری نے مرتب کیا تھا، اور دو میں بھی "خسرو شناسی" کی ایک جلد دی گئی، جو ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے تیار کی اور بورڈ کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی، ان دونوں جلدوں میں ایک اور بیرون ملک کے اہل قلم کے قابل قدر مضامین ہیں، ایران کے پروفیسر ڈاکٹر ذبیح اللہ صفائی نے اپنا ایک رسالہ "امیر خسرو دہلوی" بھی تقسیم کیا، ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے اپنی "امیر خسرو" احوال و آثار کی جس میں علامہ شبلی نعمانی سے لیکر آج تک امیر خسرو پر جو اچھے مضامین لکھے گئے ہیں، ان کا انتخاب، انگریزی کے رسالہ آرگ کا ایک شمارہ بھی تحفہ میں ملا جس میں امیر خسرو کی مثنویوں کے بعض مناظر کی تصویق کے پانے مقرر ہیں، حیاتی گیلانی نے امیر خسرو کی مثنوی نقی نامہ میں جو اضافہ کیا ہے اس کو ڈاکٹر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر ستیہ مقبول احمد نے ایک پرمنز مقدمہ کے ساتھ علیحدہ کتابی شکل میں طبع کر دیا ہے، یہ کتاب بھی حاضرین جلوسہ کو پیش کی گئی،

اسی موقع پر ایک ایرانی خاتون نے امتیازات مدرسہ عالی ادبیات و زبانہائے خارجی کی مطبوعات میں سے خلاصہ خی خسرو و شیریں لیلی و مجتوں از نظامی گنجوی، دستور زبان فارسی از پرذریہ تامل خانلمری، فردوسی، درشاہنامہ از حبیب نیما، نیرانہ، انتخاب پرذریہ تامل خانلمری، فرہنگ ادبیات فارسی از زہرے خانلمری کچھ مخصوص مہمانوں کے ساتھ اس راقم کو بھی تحفے کے طور پر دیں جس کے لئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، پچھلے پروگرام کے نام سے موسیقی کی مجلسیں بھی ان مہمانوں کے لئے ہوتی رہیں، جو اس سے دلچسپی رکھتے تھے،

سمینار شام کے نمائندے کی صدارت میں شروع ہوا، جو وہاں کے وزیر تعلیم ہیں، ان کی تقریر سے ان کا مذہبی رنگ نمایاں تھا، وہ تو کارروائی کے درمیان خاموش رہے، لیکن ان کی خاموشی کی تلافی نواب علی یاور جنگ کی قوت گوہانی سے ہوتی رہی، اس میں اچھے اچھے مضامین پڑھے گئے، سبکا ایرانی کے حافی سبک ہندی کو عام طور سے پسند نہیں کرتے، مگر ایران کے فاضل نمائندے ڈاکٹر ذبیح اللہ صفائی نے گنگر امیر خسرو کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا:-

"امیر خسرو کے از پرکار ترین شاعران پارسی گوئی دوریں باب حقا کم نظیر است"

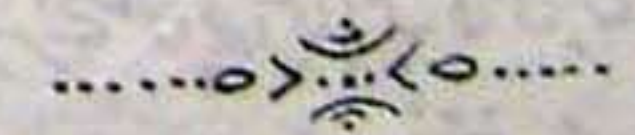
راقم نے ایک بحث میں حصہ لیتے ہوئے ان سے سوال کیا کہ یہ ان کی ذاتی رائے ہے یا وہ سبک ایرانی کے موجودہ دور کے حامیوں کے خیالات کی بھی ترجمانی کر رہے ہیں، انھوں نے اپنی جوابی تقریر میں یقین دلایا کہ سبک ایرانی کے پاسداری بھی رائے رکھتے ہیں، افغانستان کے نمائندہ پروفیسر عبدالعلیم صاحب نے امیر خسرو کو خطی ثابت کرنے کی کوشش کی اور خطی کو افغانستان کا قلیلہ تباہ، حالانکہ امیر خسرو کے دالہ کا نسبتی تعلق قبیلہ لاجین سے بتایا جاتا ہے جو وسط ایشیا میں اب بھی جو، ترکی کی ایک کسٹ خان ڈاکٹر زین اکا نے نے وہاں کے کتب خانوں میں امیر خسرو کی مثنویوں سے متعلق مثنوی کے جو نمونے ہیں، ان کو ایک پردہ پر دکھا کر مہمانوں میں بھی تقسیم کیا، امریکہ کے نمائندہ ڈاکٹر سلیمان تھیلکسٹن نے امیر خسرو کی نعت گوئی مصر کے پروفیسر ڈاکٹر ابوالمہدی سبقتی نے امیر خسرو کے تصور عشق اور اس کے نمائندوں میں ڈاکٹر طاہر محرم نے ختمہ نظامی اور خسرو اور ڈاکٹر مہر کے۔ زدا شرفیاء خسرو کے عہد میں تصوف، بنگلہ دیش کے ڈاکٹر ظفر اللہی نے خسرو کی شاعری جناب ملک آج آئندہ امیر خسرو کی ہونے پر اور جناب شہاب سرمدی نے امیر خسرو کی موسیقی پر اچھے مضامین پیش کئے، اس راقم کو پاکستان میں امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن شریک ہونے کا موقع ملا تھا، اس کی روداد سنائی تو بڑی دلچسپی سے سنی گئی،

اس بین الاقوامی مجلس میں امیر خسرو سے متعلق کچھ ایسی باتیں بھی کہی گئیں جو عام روایات کے خلاف تھیں، مثلاً سارا طلبہ حتی کہ قوال بھی ان کی ایجادات نہیں، خیال قزل، قلبانہ، نقش و نگار امین اور فرد دست وغیرہ جیسے راگ اور شنگ ان سے منسوب ہیں، مگر اس کی تصدیق ان کی کسی تحریر سے نہیں ہوتی، افضل الفوائد ان کی تصنیف نہیں، وہ ایک چالاک آدمی تھے، اسلئے شاہی دربار سے وابستہ رہے، ان کی ادبی زبان ہندی تھی، ان کے نانا عماد الملک نو مسلم راجپوت تھے، ان کی لوطنی

کا اصلی تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنی شاعری میں سنسکرت شاعری کے استعارات اور تشبیہات بھی استعمال کرتے ان کے بعض دوہے اور پہیلیاں وغیرہ ان کے نام سے غلط طریقہ سے منسوب ہو گئی ہیں اس قسم کی تنقیدیں تو زیادہ تعجب انگیز نہیں گروہ تو یہ دلائل سے مدد بھی کی جاسکتی ہیں، مگر جب یہ بحث اٹھائی گئی، کہ امیر خسرو نہ صوفی تھے، اور نہ خواجہ نظام الدین ادلیا کے مرید تھے اور ان کی بعض تحریریں ایسی بھی ہیں جن سے ان کی مذہبی ناروا داری کا اظہار ہوتا ہے تو یہ اظہار ہوا کہ معروضیت اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے نام پر اس عبقری کی تصویر کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، راقم نے کئی بار توجہ دلائی کہ امیر خسرو کی تنقیص کر کے ان کے مداحوں کو تکلیف پہنچانا ہے، یہ بھی عرض کیا کہ امیر خسرو نے گذشتہ سات سو سال کے اندر جو کچھ حاصل کیا ہے اس سے ان کو اس سہ روزہ سینار میں محروم نہ کر دیا جائے،

معروضیت اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے نام پر، بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، میرزا حیرت دہلوی نے اسی کی آڑ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کا واقعہ ہی پیش نہیں آیا، امام حسینؑ تو کرہا میں مدفون ہی نہیں ہیں، موجودہ دور کے ایک محقق مسٹر ادک تو شاہجہانی عمارتوں کو راجپوتوں کا تعمیر می شاہکار قرار دینے میں اپنی تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، مگر اس قسم کی تحقیقات سے انڈین اسکالرشپ کی اہانت ہوتی ہے، علم و فن کے وقار اور ملک کی بھی خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ تحقیق کو ذہنی بازی گری اور تفریح کا ذریعہ نہ بنایا جائے،

یہ سذرات لکھے جا چکے تھے کہ مولانا عبدالباری ندوی اور جامی زامرضی بیگ وکیل اعظم گڑھ کے انتقال پر مجال کی خبریں ملیں، مولانا عبدالباری ندوی دارالعلوم ندوہ کے مایہ ناز فرزند اور قدیم ترین یادگار تھے بڑے نامور مصنف، فلسفی اور مترجم ہونے کے علاوہ دینداری کے بھی اعلیٰ نمونہ بن کر رہے، انشا اللہ آئندہ معارف میں ان پر ایک تحریر شائع ہوگی اجنا مزامرضی بیگ اعظم گڑھ کے بہت ہی لائق ممتاز، اور وضع اور وکیل تھے، دارالضعیفین کی مجلس انتظامیہ کے اہم رکن بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کی وفات کراچی میں ہوئی، انہیں تبارک و تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز رکھیں، آمین،



مقالہ

اقبال، اسلام اور اشتراکیت

از جناب گلن ناتھ آزاد صاحب

مشہور ہائمر (۱۷۸۸-۱۸۶۰) کے افکار مغرب کی دنیا سے فلسفہ میں پوری شدت سے گونج ہی رہے تھے کہ دنیا سے سیاست میں ایک نئی فلسفیانہ آواز بلند ہوئی، یہ کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳) کی آواز تھی، وہ ۱۸۱۵ء کو جرمنی کے شہر ٹرایر میں پیدا ہوا، اس کا باپ ایک یہودی وکیل تھا جو ۱۸۲۸ء میں مارٹن لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر پروسٹنٹ بن چکا تھا، کارل مارکس ٹرایر (Trier) سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پہلے بون اور پھر برلن یونیورسٹی میں داخل ہو گیا، جہاں اس نے قانون، تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا، ۱۸۴۱ء میں فارغ التحصیل ہو کر اس نے اپنی کیوس کے فلسفے پر اپنا مقالہ ڈاکٹریٹ کے لئے پیش کیا، تعلیم کے ان مرحلوں سے فارغ ہو کر وہ پھر بون آیا، اس کا ارادہ بون ہی میں پھر رہنے کا تھا، لیکن اسے اس ارادے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی،

انگلے برس وہ کولون کے انقلابی اخبار رائٹس گوت (Rhenische) کا ایڈیٹر مقرر ہوا، اس کی ادارت میں اس اخبار کا انقلابی پہلو اور زیادہ نمایاں ہوتا چلا گیا،

حکومت نے پہلے تو اجازت پر سنسر کی قیود عائد کیں، لیکن بعد میں اسے بالکل ختم کرنے کا ارادہ کر لیا، مارکس نے اس کو بچانے کی بہت کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اور ۱۹۳۳ء میں اجازت دے دی گئی،

اسی سال مارکس نے اپنے بچپن کی ایک دوست لڑکی جینی دان سے شادی کر لی، یہ لڑکی جرمنی کے ایک رجعت پسند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، اس کا بھائی اس زمانے میں پرویشا کا وزیر داخلہ تھا،

شادی کے فوراً بعد مارکس نے پیرس کا رخ کیا، اور وہاں سے ایک ریڈیکل میگزین جاری کیا، وہ چاہتا تھا کہ اسے چوری چھپے جرمنی میں تقسیم کیا جائے، لیکن اس مقصد میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اور ایک شمارے کے بعد ہی یہ میگزین بند ہو گیا،

پیرس میں قیام کے دوران کارل مارکس کی علمی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، اس نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے متعدد کتابیں لکھیں، یہیں انجیلز (Engels) کے ساتھ اس کی دوستی کی بنیاد پڑی، اگلے برس پر ویشین گورنمنٹ کے مطالبے پر اسکو پیرس سے شہر بدر کر دیا گیا، پیرس سے اس نے برلین کا رخ کیا، ۱۸۴۴ء میں وہ اور انجیلز دونوں نے ایک حقیہ پر وگنڈا سوسائٹی کیونٹ لیگ کے ممبر بن گئے، اور اسی سال جب

لندن میں اس لیگ کی دوسری کانگریس منعقد ہوئی تو انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا، یہیں ان دونوں نے مل کر کیونٹ لیگ میں فیڈریشن قائم کیا، جس پر آگے چل کر کیونٹ لیگ میں اس کی بنیادیں قائم ہوئیں،

فروری ۱۸۴۵ء کے انقلاب میں مارکس کو بلجیم سے نکل جانے کا حکم ملا، وہاں سے وہ پیرس آیا، اور پیرس سے پھر ہارم جرمنی ہوا، وہاں ایک برس تک پھر اس نے اخبار نکالا

اس اخبار کی تحریروں کی بنا پر اس کے خلاف عدالتی کارروائی ہوئی، جب اس سے اس کا کچھ نہ بچا تو اسے جرمنی سے نکال دیا گیا، جرمنی سے نکل کر وہ پھر پیرس آیا اور وہاں سے اپنے لندن کا رخ کیا، جہاں وہ اپنے انتقال کے وقت تک رہا،

جلادہ طنی میں سکی زندگی بڑی تنگدستی اور پریشانی کے عالم میں بسر ہوئی، انجیلز قریباً اس کی مالی مدد نہ کرتا تو نہ صرف یہ کہ اس کی تصنیف "سرمایہ" مکمل نہ ہو سکتی، بلکہ خود اس کی زندگی انتہائی ناکامیوں کا شکار ہو کر رہ جاتی،

قیام لندن کے دوران ہی اس نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر پہلی انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی، اس انٹرنیشنل کا پہلا خطبہ، متعدد تجویزیں، اعلانات اور منشورات مارکس ہی کے علم کے مرہون منت ہیں، اس نے متعدد ممالک کی مزدور تحریکوں کو ایک لڑی میں پروردیا،

اور کو تاروی جہد و جہد کا طریق کار وضع کیا، ۱۸۴۷ء میں پیرس کمیون کی ناکامی کے بعد جب یورپ میں انٹرنیشنل کا زہرہ رہنا ناممکن ہو گیا تو مارکس نے اس کی جبری کو نسل کو یورپ میں منتقل کر دیا،

اس وقت تک پہلی انٹرنیشنل اپنا تاریخی رول ادا کر چکی تھی، وینا کے ہر ملک میں مزدور تحریک شروع ہو چکی تھی اور اکثر ملکوں میں سوشلسٹ پارٹیاں یا مزدور جماعتیں وجود میں آچکی تھیں،

انٹرنیشنل کے قیام اور اس کی کامیابی کے لئے اپنے خیالات کو تحریری صورت میں پیش کرنے کے لئے مارکس کو جو داغ اور جسمانی محنت کرنی پڑی اس سے اس کی صحت خراب ہو گئی، سرمایہ کی تکمیل کا کام اس کے علاوہ تھا، جس کے لئے اسے گوشے گوشے سے دنیا مواد ہی نہیں جمع کرنا پڑا بلکہ متعدد زبانیں جن میں روسی بھی شامل تھی سیکھنا پڑیں، یہ محنت اسکے

یے جان لیوا ثابت ہوئی، ۲۴ مارچ ۱۹۳۶ء کو جب کہ وہ اپنی آرام کر سی پر سو فکرتھا اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی،

ایک فلسفی تو محض افراد کے دل و دماغ ہی کو متاثر کرتا ہے، لیکن ایک سیاسی فلسفی سماجی اور معاشی نظام کو بدل کر رکھ دیتا ہے، یوں تو افلاطون اور ارسطو بھی سیاسی فلسفی تھے اور مہنگل، لاک اور مل بھی، لیکن دنیا کی سیاست پر جس طرح مارکس کے خیالات اثر انداز ہوئے، اس کی مثال تاریخ عالم میں ملنا دشوار ہے، اقبال نے مارکسزم کا اثر قبول کیا یا نہیں اور اگر کیا تو وہ اثر کیا ہے، اور کس حد تک ہے ایک انتہائی مشکل سوال ہے، ہمارے اکثر نقادوں نے اس مسئلے کو انتہائی آسان بنا کر پیش کیا ہے، مثلاً ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:-

”ہندوستان میں غالباً اردو زبان نے سب زبانوں سے پہلے آگے بڑھ کر انقلاب روس کا تیرم قدم کیا چنانچہ اقبال نے خاص مسرت کے ساتھ اعلان کیا، آفتاب تازہ پیدا ہوا یعنی گیتا سے ہوا آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک اور ساتی نامے میں انتہائی مسرت کے ساتھ عوام الناس کو یہ کہہ کے مبارکباد دی، گیا دور صریحہ داری گیا شمشاد کھا کر بھاری گیا

سرور صاحب نے اس مسئلہ پر مقابلہ جیتا ط سے قلم اٹھایا ہے، وہ لکھتے ہیں:- ”اقبال صریحہ داری کے خلاف ہیں، اردو شاعری میں سب سے پہلے انھوں نے مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی، مارکس کی وہ بڑی حمایت کرتے ہیں، مگر

ایک تو وہ اشتراکیت کی انتہا پسندی کے خلاف ہیں، اور زمین کو بچا زمیندار یا کسان کی ملکیت سمجھنے کے خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں دوسرے وہ

ان مادی قدروں سے بیزار ہیں جن پر مارکس نے اپنے تصورات کی بنیاد رکھی ہے، وہ ان کی روح اشتراکی ہے، وہ اسلامی سوشلزم ہیں۔“

ان دو مقدر نقادوں کے نظریے کے ساتھ ہی اقبال کی درج ذیل تحریریں بھی پڑھ لی جائیں تو اندازہ ہوگا کہ مسئلہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے، جتنا اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہوا ہے،

”اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی بچک اپنے اندر نہیں رکھتا، اور وہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا رسمی نامہ یا یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے“ (مضامین اقبال ص ۱۸۲)

”سوشلزم کے ماننے والے مذہب اور روحانیت کے منکر ہیں، یہ لوگ مذہب کو ایفون سمجھتے ہیں، سب سے پہلے جس شخص نے مذہب کو ایفون کہا ہے وہ کارل مارکس تھا، میں ایک مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان ہی مروں گا، میرے نزدیک تاریخ کی

مادی تعبیر (Interpretation) قطعاً غلط ہے،

(خواجہ غلام الہدیٰ کے نام خط مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

”مہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے، لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے

اسے سرور صاحب اس حقیقت کو نہ جانے کیسے فراموش کر گئے ہیں کہ اشتراکیت جب روح کی نفی کرتی ہے تو روح اور اشتراکیت میں یہ رشتہ کیونکر ممکن ہے، (آزاد)

ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاپٹھیاں کھانا، جیل جانا، گوئی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں» (مضامین اقبال ص ۱۹۶)

ان دو ایک اقتباسات سے اقبال کے نظریہ وطنیت پر بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اقبال کا رول مارکس یا سوشلزم کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے، یہ صحیح ہے کہ ۱۹۲۱ء میں اقبال نے اپنی مشہور نظم خضر راہ لکھی تو وہ سرمایہ داری کے مخالف اور مزدور کے حامی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اقبال کا رول مارکس کی بڑی حمایت کرتے ہیں، اقبال کے افکار کی صحیح ترجمانی نہیں ہے، اور پھر اقبال کو اسلامی سوشلسٹ کہنا تو اسلام اور سوشلزم دونوں کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ہے، کیونکہ اقبال بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور وہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی پچک اپنے اندر نہیں رکھتا، اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ نے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا مجھوتہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں اور اصل اسلامی سوشلزم کی ترکیب ایک ایسی ترکیب ہے جو کتابوں میں تو موجود ہے، لیکن دنیا کے کسی سیاسی نظام میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے، یہ ترکیب مفہوم سے قطعاً خالی ہے اور اس کا طول و عرض بس اتنا ہے کہ یہ دو متضاد نظاموں میں ایک ایسی مفاہمت کا پہلو لئے ہوئے نظر آتا ہے، جو عملی دنیا میں مفقود ہے،

۱۵۔ مولانا اقبال الدین افغانی (۱۸۹۶ء - ۱۹۸۳ء) نے اول اول اشتراکیت کے تصور کو اسلام کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی، انہوں نے اس موضوع پر اپنے مقالات میں جو انہوں نے ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۴ء کے درمیان لکھے بحث کی ہے، مسلم ورلڈ، ہارٹ، فورڈ، کننگھم کٹ (جنوری ۱۹۶۷ء) میں پروفیسر سامی نے اپنے "افغانی" اشتراکیت الاسلام کا پہلا رہنما کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے۔

پاکستان کے مشہور مورخ اے کے۔ بروہی اقبال کی اجتہاد اور اسلامی سوشلزم کا نظریہ کے زیر عنوان ایک مقالے میں لکھتے ہیں:-

”یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلامی سوشلزم — اگر ہم اس کے عملی امکانات کو سمجھیں — ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہے؛ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ عرض کر دوں گا کہ مجھے یہ سمجھنے میں سخت وقت کا سامنا ہے، کہ آخر اسلامی سوشلزم کے نظریے کا مطلب کیلئے، سوشلزم کی اصطلاح ہر شخص سمجھ لیتا ہے، اور میرا خیال ہے کہ ”اسلام“ کی اصطلاح کا مطلب بھی میں سمجھتا ہوں، اگر مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجائے تو میں یہ کہوں گا کہ ان دو الفاظ کا غیر منطقی اختلاط ایک معقول ذہن کو حلقہ سارے دوچار کر دیتا ہے، اس دو غلط لفظ ”اسلامی سوشلزم“ سے ذہن کو جس مجھے سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی تفصیل یوں پیش کی جاسکتی ہے، — اگر سوشلزم کا مطلب بالکل وہی ہے جس کا اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے تو پھر سوشلزم بطور ایک تو محض نظریے کے بھی نہیں

دقیقہ حاشیہ صفحہ ۹) جس میں البرٹ ہورانی کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ”اگرچہ اشتراکیت اسلام کی ترکیب شبلی شہیل (۱۹۱۷ء - ۱۹۵۰ء) نے وضع نہیں کی، لیکن غالباً وہ پہلا مصنف تھا، جس نے عربی زبان و ادب میں اشتراکیت کے مفہوم کو فروغ دیا، اس مقالے میں پروفیسر ہانانے شام کے مشہور فاضل مصطفیٰ اباعی کی کتاب ”اشتراکیت الاسلام“ کا ذکر بھی کیا ہے، مقالے کے آخر میں مصنف لکھتے ہیں، اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ اسلامک سوشلزم کے تصور پر مزید روشنی ڈالی جائے، اس موضوع پر جو خیالات آج کل پیش کئے جا رہے ہیں، ان کا بظاہر تاریخ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا، اس لئے اس تصور کی صحیح اہمیت کا بتہ نہیں چل رہا ہے اشتراکیت کے موضوع پر مزید تحقیق کی اسلئے بھی ضرورت ہے کہ اس کا عرب تہذیب (اسلامی تہذیب نہیں) کیساتھ ایک نظری تعلق نظر آتا ہے،

قابل قبول ہونا چاہئے، لیکن اگر روایتی سوشلزم کو اسلام ہمارے لئے قابل قبول قرار نہیں دیتا، تو پھر سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس نظریے میں کیا تبدیلی کی ہے جسکی وجہ سے اسے اسلامی سوشلزم کا نام دیا جاسکتا ہے، اور سوشلزم کی غیر اسلامی اقسام کے مقابلے میں اسلامی سوشلزم قابل قبول بن جاتا ہے، فقط اسلام بذات خود مستقل بالذات ہے، آخر اس کو اس قدر کیوں گمراہ کیا جائے، کہ یہ سوشلزم کا لاحقہ یا سابقہ بن کر رہ جائے، جہاں تک صحیح معلوم ہے اس ملک کا کوئی بھی شخص اس سوال کا منطقی اور دیانتدارانہ جواب نہیں دے سکتا، ایک طرف کیا ہم نہیں کہتے کہ اسلام ایک جامع ضابطہ حیات ہے جس میں بنی نوع انسان کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی تنظیم سے متعلق جملہ مسائل کے حل موجود ہیں دوسری جانب یہ بتایا جاتا ہے، کہ سوشلزم نام کا بھی ایک نظریہ موجود ہے، جس کی ہمیں ضرورت ہے، بشرطیکہ ہم اس میں کچھ رد و بدل کر لیں، اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ صرف اسلام نہیں بلکہ یہ اسلامی سوشلزم ہے، جو ہمیں نجات دلائے گا، اور اس وقت ہماری زندگی کا جو نظم و ضبط ہے، اسلامی سوشلزم کی بدولت ہم اس نظم و ضبط کا بدرجہا زیادہ معنی خیز اہتمام کر سکیں گے،

اسلام اگر ایک عالمگیر مذہب ہے یعنی اگر ایک ایسا طرز زندگی ہے جو ہر دور اور تمام جغرافیائی حالات میں تمام لوگوں کے لئے موزوں ہے، تو پھر یہ ان مخصوص اقتصادی اور سیاسی مسائل کا مناسب حل پیش کرنے سے کیوں قاصر ہے جن سے ہم پاکستانی آج کل دوچار ہیں، اور جن کی وجہ سے ہم غیر ملکی تہذیب اور ثقافت سے نمونہ مستعار لینے پر مجبور ہیں، اگر سوشلزم کا مطلب سماجی تنظیم کے ایسے طریقے

پالیسی سے لیا جاتا ہے جو اس امر کی داعی ہے کہ جملہ ذرائع پیداوار، سرمایہ آرضی اور املاک تمام معاشرے کی ملکیت قرار دیدیے جائیں، اور ان کا انتظام و تقسیم بھی سب کی بہبود کے لئے عمل میں لائی جائے، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اس ضمن میں کچھ کہنے سے قاصر ہے، اگر آپ کے خیال میں حصول انصاف کا یہی واحد طریقہ ہے تو آپ سوشلزم کے نظریے یا طریق کار کے حلقہ بگوش ہو سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس آپ کے نزدیک سوشلزم کے نظریے اور پالیسی سے انصاف کے موقف کو تقویت ملنے کے عوض ٹھیس لگتی ہے، تو آپ کو اس نظریے کا حلقہ بگوش ہونے سے انکار کر دینا چاہئے، لیکن اس کا اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، انصاف کے حصول کے لئے سوشلزم کا طریق کار آج تو موزوں ثابت ہو سکتا ہے، آگے چل کر موزوں نہ رہے، اس لئے اسلام کو اس جھگڑے میں الجھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، (نوائے وقت لاہور، ۱۸ مئی ۱۹۷۷ء)

اے کے بروہی کی یہ تحریر اسلام اور سوشلزم کے بارے میں علامہ اقبال ہی کے افکار کی صداے بازگشت ہے،

اقبال کے بارے میں یہ غلط فہمی کہ اقبال اسلامی سوشلسٹ تھے دور استوں سے آئی ہو، ایک تو اقبال کی جاوید بھری شاعری خود اس کی ذمہ داری ہے جو اپنے بے پایاں کیف و تاثر کے ساتھ قاری کو بہا لیا جاتی ہے، ایک ایسے کیف و تاثر کے ساتھ جو اقبال سے پہلے اردو شاعری میں موجود نہیں تھا، اور دوسرا ایڈورڈ تھا من اور جو اہر لال نہرو کی تحریروں سے، اقبال نے

لے اس کا ایک تیسرا سبب بعض پڑھے لکھے ہندو ستانیوں کا ضعف ایمان بھی ہو سکتا ہے، وہ ترقی پسندی کے شوق میں اپنے آپ کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ کہلاتا بھی پسند کرتے ہیں اور ساتھ ہی (بقیہ صفحہ ۹۴ پر)

جب یہ کہا۔

ہندو مزدور کو جا کر مر پیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار جیلہ گر
دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
نسل قومیت، کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا ادرا ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

نئے بیداری جمہور ہے سامان عیش
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
توقاری جس نے کسی سرمایہ دمحنت کی آدیزش کا ذکر اور دوشاعری میں دیکھا نہیں تھا اور
سرمایہ دمحنت کی آدیزش کا تصویر جس کے یہاں مارکس کی تحریروں اور انقلاب روس کے ذریعے
سے آیا تھا فوراً ہی طور پر اس کے سوا اور کس نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ اقبال سوشلزم کا پیغام لیکر

(بقیہ طیشہ ۱۹۷۶ء) یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ہندو یا مسلمان بھی کہلائیں، سنا ہے کمیونزم اور سوشلزم کے
بعض ہی خواہ ایسے بھی ہیں جو تحریروں اور تقریروں میں مذہب کی پورے طور سے نفی کرتے ہیں لیکن
وہ تو ہم پرستی کی حد تک مذہب سے وابستہ ہیں، اور ان انجمنوں کے ساتھ بھی انکار بطور ضبط ہے، جن کی نیا
مذہب ہی پر نہیں فرقہ پرستی پر ہے، اے

معتوق ماہر شہوہ ہر کس برابر است
بابا شراب خورد رہ زابد نماز کرد

یہ طرز عمل صرف ضحیف ایمان ہی نہیں بلکہ مصلحت اندیشی کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے،

آئے ہیں، خضر راہ کے طلسم نے قاری کو یہ سوچنے کا موقع ہی کہاں دیا کہ سوشلسٹ کبھی یہ
میں کہتا کہ

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصاروں میں ہو

سوشلسٹ تو یہ کہتا ہے

جو کرے گا ایتنا زنگ و خون اٹ جائے گا

لیکن یہ نہیں کہتا

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

سرور کی زبیا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

حکراں ہے اک وہی باقی بٹان آذری

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا

طریق کو کہن میں بھی وہی چیلے ہیں چنگیزی

اصل میں اقبال کا قلم پارہس تھا اور ایسا پارہس کہ جو صرف پتھر ہی کو نہیں بلکہ لوہا، لکڑی

جس چیز کو بھی چھو لیتا تھا اسے خالص سونا بنا دیتا تھا اور اس سونے کی تابناکی نے ہر دیکھنے والے

کی آنکھوں کو چمکا چوند کر دیا،

دوسرا سبب جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے جو اہر لال نہرو اور ایڈورڈ تھا من کی تحریریں

ہیں، جو اہر لال نہرو اپنی تصنیف ”دریانت ہند“ میں لکھتے ہیں۔

”عمر کے آخری حصے میں اقبال زیادہ سے زیادہ سوشلزم کے قریب ہوتے گئے، سویٹ

روں نے جو عظیم ترقی کی تھی، وہ اس سے متاثر ہوئے، اور ان کی شاعری نے بھی ایک

نیازنگ اختیار کیا، (۱۹۵۶ء ڈیشن مطبوعہ لندن ص ۳۵۵)

جو اہر لال نہرو نے دریافت ہند کے اس حصہ میں اقبال کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے، لیکن چونکہ اس ملاقات کی باقی باتیں میرے اس مقالے کے احاطے سے باہر ہیں، اس لئے میں اپنی بات حیت اقبال اور سوشلزم کے بارے میں جو اہر لال نہرو کے خیالات ہی تک محدود رکھوں گا۔ جو اہر لال نہرو کی اقبال سے یہ ملاقات جنوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی، اقبال کے انتقال سے تین ماہ قبل معلوم نہیں جو اہر لال نہرو نے اقبال کی کس بات سے یہ اندازہ لگایا کہ اقبال عمر کے آخری حصے میں سوشلزم کے قریب ہوتے چلے گئے حالانکہ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ریڈیو سے نئے سال کا پیغام نشر کرتے ہوئے اقبال واضح طور پر یہ کہہ چکے تھے،

..... لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے

جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، منطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اڈھ کر رکھے ہیں، ان نقابوں کی آڑ میں حریت اور نثر انسانیت کی ایسی مٹی پیدا ہو رہی ہے، کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ (حرف اقبال

۱۹۵۵ء ص ۲۲۳)

لے اگرچہ جو اہر لال نہرو نے اپنی تحریر میں تاریخ ملاقات بیان نہیں کی لیکن یہ ملاقات اس وقت ہوئی جب نیت جی جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹریٹ لا کے ازالہ حیثیت عرفی کے استغاثہ میں شہادت دینے کیلئے لاہور تشریف لائے تھے اور میاں افتخار الدین کے یہاں ٹھہرے تھے، اس ملاقات کے دوران میاں افتخار الدین بھی موجود تھے اور راجہ حسن اختر بھی، لاہور میں اس ملاقات کا بڑا چرچا ہوا اور اقبال کا یہ فقرہ کہ جو اہر لال آپ محب وطن ہیں اور جناح سیاست داں، لاہور میں بچے کی زبان پر تھا، مجھ سے اس ملاقات کا ذکر ڈاکٹر محمد عالم نے کیا تھا جن کا میں ۱۹۳۵-۳۶ء میں پرائیویٹ سکریٹری رہا،

اس پیام کے بعد یہ اندازہ کرنا کہ اقبال اشتراکیت سے قریب آرہے تھے، ایسی بات ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی، اور پھر نہ جانے جو اہر لال نہرو نے کس بنا پر یہ لکھ دیا کہ سویت روس کی ترقی سے متاثر ہو کر اقبال کی شاعری نے بھی ایک نیازنگ اختیار کیا، سویت روس کی ترقی سے متاثر ہو کر اقبال نے نظمیں تو ضرور کہیں لیکن یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری نے نیازنگ اختیار کیا ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید اقبال کی شاعری نہیں کرتی،

اس زمانے میں غلام رسول خاں اور ڈاکٹر عاشق حسین ڈالوی علامہ اقبال کے سکریٹری تھے، ڈاکٹر عاشق حسین نے مجھے بتایا کہ بات حیت کے دوران جب مسٹر جناح کی لیڈری کا ذکر چھڑا اور نپٹت جو اہر لال نہرو نے کچھ دہنی زبان سے جناح صاحب کے طرز عمل پر اعتراض کیا تو علامہ مرحوم نے نپٹت جی کو مخاطب کر کے انگریزی میں فرمایا تھا،

”جناح واحد شخص ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے کچھ کہہ سکتے ہیں،

اور میں ان کا معمولی سپاہی ہوں۔“

ڈاکٹر عاشق حسین کا یہ کہنا ہے کہ یہ فقرہ من و عن علامہ اقبال ہی کے الفاظ میں ہے،

اقبال کا یہ مبینہ فقرہ یہاں درج کر کے میں اقبال اور جناح کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر جنوری ۱۹۳۸ء تک اقبال کے خیالات جناح اور جناح کی سیاست کے بارے میں یہ تھے کہ وہ اپنے آپ کو ان کا معمولی سپاہی کہتے تھے، تو پھر انہیں عمر کے آخری حصے میں زیادہ سے زیادہ سوشلزم کے قریب۔“

کتا کسی غلط فہمی اسی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

لے جناح کے بارے میں اقبال کی اس رائے سے جو اہر لال نہرو کے مندرجہ ذیل خیالات کی بھی تردید ہوتی ہے، جو انہوں نے اقبال کے بارے میں دریافت ہند میں بیان کئے ہیں۔ (بقیہ جانشین صفحہ ۹۸)

اقبال اور جواہر لال دوزوں نابغہ تھے، عالم تھے، سیاسیات حاضرہ پر دونوں کی گہری نظر تھی، اور دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، جواہر لال کے بارے میں اقبال کتنی ادب و محبت سے لکھتے تھے، اس کا اندازہ اقبال کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے جواہر لال ہندو کے بارے میں لکھے ہیں۔

”میرے لئے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ پنڈت جی کو مشرق کے بلکہ ساری دنیا کے ایک عظیم انسان سے جو دیکھی ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست قائد ہیں، جنھوں نے دینائے اسلام کی موجودہ رو جاتی سمیٹنی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے“

لیکن اس باہمی احترام کے باوجود اقبال اور جواہر لال کے راستے الگ الگ ہیں، اور وہ کسی میدان میں بھی دو قدم ایک ساتھ چلتے نظر نہیں آتے، ”دیافت ہند“ میں مصطفیٰ کمال کا ذکر

(یقیناً حاشیہ صفحہ ۹۹) اقبال پاکستان کے اولین مایوں میں تھے، لیکن اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خطرات کو جان گئے تھے جو تصور پاکستان سے وابستہ تھے اور اس تصور کے کھوکھلے پن سے بھی آشنا تھے، اذیور و تو تھامن نے لکھا ہے کہ بات چیت کے دوران میں اقبال نے انھیں بتایا کہ میں نے پاکستان کی حمایت محض اس لئے کی ہے کہ میں مسلم لیگ کا صدر ہوں، اور نہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ ہندوستان کے لئے بحیثیت مجموعی اور مسلمانوں کے لئے خاص طور سے مضرت رسا ثابت ہوگا، اس کا سبب یہ تھا کہ، غالباً بعد میں ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی یا شروع میں انھوں نے اس سوال پر پوری طرح سے غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس سوال کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی، زندگی کے بارے میں اقبال کا نظریہ، اول سے آخر تک ان حالات و واقعات کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا جو تصور پاکستان یا تصور تقسیم ہند کے نتیجے کے طور پر رد و ناما ہوتے چلے گئے،

کرتے ہوئے جواہر لال ہندو لکھتے ہیں:-

”مصطفیٰ کمال نے ترکی کو غیر ملکی اقتدار سے نجات دلوائی، صرف یہی نہیں بلکہ یورپی سامراجی طاقتوں بالخصوص انگلستان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا، لیکن جوں جوں مصطفیٰ کمال کی پالیسی کھل کر سامنے آئی گئی اور یہ نظر آتا گیا کہ مذہب سے انھیں لگاؤ نہیں، سلطانی اور خلافت کو وہ ختم کرنے کے حق میں ہے، ملک میں ایک سیکولر نظام لانے کے لئے کوشاں ہے، اور اس حکومت کو جو بڑی بنیادوں پر قائم ہو، باقی رہنے کے حق میں نہیں ہے، تو راسخ العقیدہ مسلمانوں میں اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کم ہونی شروع ہو گئی ہے، لیکن یہی پالیسی ہندوؤں اور مسلمانوں کے نوجوان طبقے میں ان کی زیادہ ہر دلعزیزی کا باعث بنی“

قریب قریب ایسے ہی خیالات کا اظہار جواہر لال ہندو نے اپنے اس مقالے میں کیا تھا جو ٹاؤن ریویو میں شائع ہوا تھا اور جس میں انھوں نے احمدیت کو موضوع بحث بنایا تھا، اقبال نے اس کے جواب میں جو مقالہ لکھا، اس میں جواہر لال ہندو کے مصطفیٰ کمال اور ترکی کے بارے میں خیالات پر بھی بحث کی، اس بحث کے دوران میں انھوں نے لکھا:-

”وکیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک خاص طور سے ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال ہندو خیال کرتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا، معلوم ہوتا ہے اور اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی، مسلمانوں کے نقطہ نظر سے خالص فقہی سوال ہے، اور اس کا فیصلہ اسلام کی اسسٹنٹ ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑے گا، جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے یعنی توحید اور ختم نبوت تو اس کو ایک راسخ العقیدہ

ملا بھی اسلام کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتا، خواہ فقہ اور آیات قرآنی کی تاویلات میں وہ کتنی ہی غلطیاں کرے، غالباً پنڈت جو اہر لال ہندو کے ذہن میں وہ مفروضہ یا حقیقی اصطلاحات میں جو اتا ترک نے رائج کی ہیں، اب ہم تھوڑی دیر کے لئے ان کا جائزہ لیں گے، کیا ترک میں ایک عام مادی نقطہ نظر کا نشوونما اسلام کے منافی ہو؟ مسلمانوں میں ترک دینا کا بہت رواج رہ چکا ہے، مسلمانوں کے لئے وقت آچکا ہے کہ وہ حقائق کی طرف متوجہ ہوں، مادیت مذہب کے خلاف ایک بڑا حربہ ہے، لیکن ملا اور صوفی کے پیشوں کے استیصال کے لئے ایک موثر حربہ ہے، جو عمدہ لوگوں کو اپنی غرض سے گرفتار حیرت کر دیتے ہیں کہ ان کی جہالت اور زود اعتمادی سے غائدہ کھائیاں اسلام کی روح مادہ کے قرب سے نہیں ڈرتی، قرآن کا ارشاد ہے، کہ تمہارا دینا میں جو حصہ ہے، اس کو نہ بھولو، ایک غیر مسلم کے لئے اس کا بھنا دینا ہے، گدڑ شہ چند صدیوں میں دینے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے، اس کے لحاظ سے مادی نقطہ نظر کی ترقی تحقق ذات کی ایک صورت ہے، کیا لباس کی تبدیلی لاطینی رسم الخط کا رواج اسلام کے منافی ہو؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی وطن نہیں اور بحیثیت ایک معاشرت کے اسکی نہ کوئی مخصوص زبان ہے اور نہ کوئی مخصوص لباس، قرآن کا ترک کی زبان میں پڑھا جانا تاریخ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں، اس کی چند مثالیں موجود ہیں، ذاتی طور پر اسکو فکر و نظر کی ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں، کہونکہ عربی زبان کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقل ہے تو وہ عربی ہے، بہر حال اب یہ اطلالیں آ رہی ہیں کہ ترکوں نے ملکی زبان میں قرآن کا پڑھنا ترک کر دیا ہے، تو کیا کثرت از رواج کی ممانعت یا علماء پر لائسنس حاصل کرنے کی قید منافی اسلام ہے؟

فقہ اسلام کی رو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر مجاز ہے، کہ شرعی اجازتوں کو منسوخ کر دے، بشرطیکہ اس کو یقین ہو جائے کہ یہ اجازتیں معاشرتی فساد پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں، رہا علماء کا لائسنس حاصل کرنا، آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں نافذ کر دیتا، ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش ملا کی ایجادات کا نتیجہ ہے، قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتا ترک نے وہ کام کیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے بھرنا ہو جاتا، رسول کریم کی ایک حدیث مشکوٰۃ میں درج ہے جس کی رو سے وعظ کہنے کا حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو حاصل ہے، خبر نہیں اتا ترک اس حدیث سے واقف ہیں یا نہیں تاہم یہ ایک ہجرت انگیز بات ہے کہ ان کے اسلامی خمیر کی دوشنی نے اس اہم ترین معاملے میں اس کے میدان عمل کو کس طرح منور کر دیا ہے؟

اسی مقالے میں آگے چل کر علامہ اقبال لکھتے ہیں:-

”پنڈت نہرو نے جس اصلاح کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیا ہے، معلوم ہوتا ہے، وہ یہ خیال کرتے ہیں، کہ ایسا نصب العین اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ترکوں اور ایرانیوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے، تاریخ کا طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا، جب کہ وحدت انسانی کے قدیم اصول جیسے خوئی رشتہ اور ملوکیت ناکام ثابت ہو رہے تھے، پس اسلام نے وحدت انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ روح انسانی میں دریافت کیا، نوع انسانی کو اسلام کا اجتماعی پیغام ہے کہ نسل کی قیود سے آزاد ہو جاؤ، یا باہمی لڑائیوں سے ہلاک ہو جاؤ“

یہ دونوں اقتباسات کچھ زیادہ طویل ہو گئے ہیں، لیکن ان اقتباسات سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مذہب کے بارے میں اس قسم کے خیالات رکھنے والے فن کار کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اشتراکی ہے یا اشتراکیت سے قریب ہے، اب رہت اس قسم کے اشعار

ابھی تک آدمی صید زبون شہریار ہے	قیامت کے دن انسانوں کا شمار ہی ہے
تبرک کی فنون کاری سے محکم ہو نہیں سکتا	جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
افسر باد شہی رفت رہہ بیغمانی رفت	نے اسکندر می و نعمت دارائی رفت
کو کین تیشہ بدست آمد پر دیزی خواست	عشرت خواجگی و خست لالائی رفت

چشم بختا اگر چشم تو صاحب نظر است

زندگی در پئے تعمیر جهان دیگر است

من دریں خاک کن گوہر جاں می بینم	چشم ہر ذرہ جو انجم نگران می بینم
دانہ را کہ بر آغوش زمین ست ہمنوز	شاخ و شاخ رو مند و جوان می بینم
کوہ را ش پر کاہ سبک می یابم	پر کاہے صفت گوہ گراں می بینم
انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک	بینم و ایچ نہ انجم کہ چہاں می بینم

خرم آن کس کہ درین گہر دوسوائے بیند

جو ہر نعمت ز لہر زین تار سے بیند

تو ان کا محرک ایک تو وہ درد انسانی ہے جس سے اقبال کی شخصیت عبارت تھی دوسرا حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر اور تیسرا ان کی بصیرت یا فراست جس کی بدولت انہوں نے ۱۹۱۱ء میں یہ شعر کہے تھے،

دیار مغرب کے رہنے والے ہیں ان کی تبتی و کان نہیں ہو
کھرا جے تم سمجھو ہے ہو وہ اب زہر کم عیار ہو گا

تعماری تہذیب اپنے خنجر سے ایک ن خود کشی کر گئی جو شاخ نازک پہ آستانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا
آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ روس میں اتنا بڑا انقلاب نمایاں ہو اور اقبال ایسا حساس فن کار اس سے متاثر ہی نہ ہو، لیکن متاثر ہونا اور بات ہے اور اپنا نظریہ اور عقیدہ اس کی تدرک و نیا دوسری بات ہے، اقبال اس انقلاب سے صرف متاثر ہی ہوئے ہیں اور متاثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام بھی ملکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے، اور انقلاب روس نے بھی ملکیت اور سرمایہ داری کو اپنا نشانہ بنایا، اور نہ جہاں تک مارکس کے نظریہ اشتراکیت کا تعلق ہے اقبال کے لئے اس نظریے کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ایک اشتراکی کے لئے خدا، روح اور مذہب تینوں سے انکار لازمی ہے،

بالشوزم میں اگر خدا کا تصور شامل کر دیا جائے تو اس سے اسلام معرض وجود میں نہیں آجائے گا، بلکہ کوئی اصل بے جوڑ قسم کا نظام رونما ہو گا جس کا تجربہ ابھی تک دینے نہیں کیا اقبال نے اپنے ایک خط میں سرفرائس ٹیک ہسپتال کو لکھا تھا، کہ چونکہ بالشوزم میں خدا کا تصور شامل کرنے سے وہ بظاہر اسلام کا مماثل ہو جاتا ہے، اس لئے ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب اسلام روس کو نکل لے یا روس اسلام کو نکل لے۔

تو انقلاب روس کے اس پہلو سے کہ اس نے ملکیت اور سرمایہ داری کو اپنا نشانہ بنایا اقبال بڑی حد تک متاثر ہوئے، اور ان کا یہ تاثر طرح طرح سے شعر کے دکش پیکر میں ڈھل کر آیا، پیام مشرق میں صحبت رنگاں (در عالم بالا) ایک بڑی دکش نظم ہے، جس میں انسانی تہذیب ہے کہ سرمایہ کے لشکر نے روٹی کے لئے ظلم کی تلوار ہاتھ میں اٹھائی ہے، ملکیت کے اس غلام کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہی، یہ بیگانوں کا دوست اور اپنی کا دشمن بن گیا ہے، تاج (ملکیت)

لے روس کا مشہور شاعر جس نے یورپ کی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کیا (اقبال)

کلیسا (مذہب) اور وطن انسان کے حق میں نئے (بے ہوشی) کی کیفیت رکھتے ہیں، خواجہ (ملوکیت) نے ایک ہی جام سے جانِ خدا اور خریدنی ہے، کارل مارکس اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتا ہے 'رازِ دانِ جزو و کل از خویش نا محرم شد است'

آدم از ہر بابتیاری قاتلِ آدم شد است

اب اس مقام پر بیگیل اگر اپنا فلسفہ چھانٹتا ہے اور کہتا ہے کہ اخذ اور پر غور کرنے، ہی سے انسان پر حقیقت واضح ہو سکتی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حنظل اور دیگر کی اصل ایک ہے، اور یہ دونوں ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہیں، فطرت اخذ اور خیز واقع ہوتی ہے اور انہی اخذ اور کے طفیل نظام عالم کا کارخانہ چل رہا ہے، کیونکہ انہی اخذ اور کی بدولت جدیاتی کیفیت رونما ہوتی رہتی آ رہی ہے کہ بہب خواجہ و مزدور اور آمر و مامور ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہیں گے،

یہاں ٹاسٹائی ہیگل سے مخاطب ہو گئے کہتا ہے کہ عقل و درخی چال چلتی ہے یہ سرمایہ دار کو تدرستی اور بند و مزدور کو سرمایہ دار کی رضا جوئی کا درس دیتی ہے، یہاں آ کر یہ نظم انتہائی

لے جرم کا مشہور امریکی ماہر اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف فکمی جہاد کیا، اس کی مشہور کتاب 'موسوم بہ سرمایہ' کو مذہب اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہئے (اقبال)

لے جلوہ دہر باغ و راز معنی مستور را
عین حقیقت نگر حنظل و انگور را

فطرت اخذ اور جزالت پیکار دار
خواجہ و مزدور را آمر و مامور را
سٹہ ٹاسٹائی کی زبان سے یہ شعر کلا کے اقبال نے ہیگل کے فلسفے پر پوری روشنی ڈالی ہے، اس کی بیگیل کے بارے میں اقبال ایک اور جگہ پر کہہ چکے ہیں

بیگیل کا صدن گھر سے خالی ہے اس کا ظلم سب حیسانی
اس سے مراد یہ ہے کہ اگر مقامات پر آ کر وہ کنڈن و کاہ برادر و بن کے (یقیناً شہنشاہ پر)

فنی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے اور ایران کا قدیم فلسفی حکیم مزدک ٹاسٹائی کی تائید میں آگے بڑھتا ہے اور بڑی مسرت سے اعلان کرتا ہے کہ میں نے آج سے سپدرہ سو برس پہلے خاک ایران میں جو بیج بویا تھا وہ آج پھل لارہا ہے، یعنی آج یورپ میں بادشاہت ختم ہو رہی ہے اور اسٹراکٹ رفتہ رفتہ اپنے قدم بظاہر ہی ہے مزدک کی یہ گفتار اقبال کی سحر آفریں زبان سے نکلے،

دانیا ایران گذشت زار و قیصر بر دمید
مرگ قومی رقصہ اند و قصر سلطان و امیر
بدتے در آتش مزدوم می سوزد و خلیل
تا تہی گرد و حرمیش از خداوندان و پر
دور پرویزی گذشت لے کشتہ پرویز خیز
نعمت گم گشتہ خود را ز خسرو باز گیر

اس ڈرامے کا آخری کردار کوہن ہے، جو مزدور کی علامت ہے وہ دنیا بھر کے مزدوروں کو ملوکیت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے،

نگار من کہ بے سادہ و کم آیز است

ستیزہ کیش دستم کو شاد و فتنہ انجیز است

برون او ہمسہ بزم و درون او ہمہ بزم

زبان او ز میخ و دیش ز چنگیز است

گست عقل و جنوں رنگ بست و دیدہ گذشت

در آ بجلوہ کہ جانم ز شوق بسیدیز است

دقیقہ ماشیہ صفا کے وہ جاتا ہے، اور پھر اس کا انداز بیان ایسا ہے جو چاہے اس کی اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق تاویل کر سکتا ہے، اس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ایڈورڈ کینز نے ہیگل کا تتبع کیا تو اس نے بیسائے کے اصول عقل کی روشنی میں پیش کیے اور سارکس اس کے نقش قدم پر چلا تو اس نے وہ حایت سے قطعاً بگاڑ کیا، اور راقہ پرستی کی بنیاد رکھی لے میرا معشوق یعنی سرمایہ دار،

اگرچہ تیشہ من کوہ را ز پیا آندد

ہنوز گردشیں گروں پہ کام پرویز است

ز خاک تا پہ فلک ہر جہ ہست پہ پیاست

قدم کشاکشہ رفتار کاروان تیز است

باقی

پاکستان میں چار مہینے

از

سیہ صبا ح الدین عبدالرحمن

(۴)

یہ بھی مزدور کی برتری کا مضمون اردو دنیا ایک اور سحر کار ایڈیٹرز سے ہمارے سامنے آتا ہے جب

فرشتے خدا سے کہتے ہیں،

خلق خدا کی گھات میں زند و فقیہ دیروایر

تیرے جہاں میں ہے وہی کہوش صبح و شام ہوں

تیرے امیر حال مست تیرے فقیر حال مست

بندہ ہے کوچہ کوچہ ابھی خراجہ بلند باہم ابھی

تو خدا انھیں یہ فرمان دیتا ہے،

انصوری دنیا کے عزیزوں کو جگا دو

کارخ امرا کے درو دیوار ہلا دو

گراؤ ظالموں کا لہو سوز یقین سے

کھنکھ فر دما یہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانی جہود کا آتے نہ مانہ

جز نقش کمن تم کو نظر آئے مشا دو

جس کھیت سے وہ تھاں کو میسر ہو روزی

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اس آخر الذکر شعر سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کس حد تک انکسز م کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں،

اقبال کا دل

اس میں علامہ اقبال کے سوانح حیات، ان کے بہترین اشعار کے انتخاب اور ان کے کلام کی ادبی خوبیوں کے اظہار کے ساتھ ان کی شاعری کے اہم موضوعوں مثلاً فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

مولفہ مولانا عبد السلام ندوی،

کی گئی ہے،

اقبال پر ایک اہم کتاب | جناب بشیر احمد ڈار نے اقبال پر جو کتاب لکھی ہے، وہ پانچ سو چھپایا

سے کی ہے، جس محنت اور دیدہ وری سے لکھی گئی ہے، پاکستان میں ایسی تصنیف کم قلمبند ہوئی ہوگی، اس کے

مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر کانٹ کے فلسفہ استدلال اور قوتِ ارادہ کی نشانی کی فکر

خود آگاہی، شوپنہار کے تخیلی فکر، قوتِ ارادہ، اور طبی معلومات اہلٹن کے نظریہ شیطنت پر ان کے

تخیلی ہنس کی روشنی خیالی، نٹس کے مستقبل کے خواب جس وارڈ کے فلسفہ پر سائنٹفک اثر،

عقلیت اور میکا نزم کے خلاف میک ڈوگل اور لارڈ مورگن کی بغاوت، ولیم جیمس کے نظریہ

عملیت، کارلائل کے چارٹرزم، پروڈنگ کی پیچہ نوازی اور نارڈشا کے فلسفہ قوتِ ارادہ پر گہرے

طور پر رہی ہے، مگر ان تمام فلسفیانہ نظریوں پر بحث کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اقبال نے ان

فلسفیوں میں سے کسی ایک کی بھی کورانہ تقلید نہیں کی ہے، بلکہ ان کی اپنی ایک اہم حیثیت ہے جس کی

مانندت ان میں سے کسی ایک فلسفی سے بھی نہیں کی جاسکتی ہے، (ص ۵۴۴)

مصنف کی حسب ذیل رائے بہت ہی غور و فکر پر مبنی ہے جس سے اس راقم کو بھی اختلاف

نہیں ہے،

"اقبال نے ذہنی کے مسائل کو اپنی انفرادی نظر سے دیکھا ہے اور اسلام کے

بنیادی اصولوں پر مبنی ہے، ان پر مسلم کلچر کا رنگ چڑھا ہوا ہے، اس پر بحث یا نسل
فصول ہے کہ ان کے خیالات کی تنظیم نے جملے اجزا سے ہے، جن کے کچھ حصے کبھی
ایک اور کبھی دوسرے مغربی مفکر سے مستعار لئے گئے ہیں، ان کے اپنے خیالات میں
ایک خاص ترتیب و تنظیم ہے، جو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں، ان کے بعض
خیالات بظاہر مغربی مفکرین سے ملے جملے معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ خیالات وہی
ہیں، جو مسلمان مفکروں کے یہاں بھی گذشتہ دور میں پائے گئے ہیں، اس کا فرق
ضرور ہے کہ سائنس کی نئی ایجادات اور خیالات کی تدریجی ترقی سے ان ہی خیالات
کو زیادہ بہتر اور منطقیانہ طور پر مرتب کر دیا گیا ہے، اقبال کا کام یہ ہے کہ انھوں نے
جدید رنگ کے علم و فضل سے پورا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ان فلسفیانہ خیالات کا
اظہار کیا ہے، جو اسلام کے بنیادی عقائد پر مبنی تو ضرور تھے، لیکن وہ اسٹیل نظر انداز
ہو رہے تھے کہ لوگوں کو ان کی عام واقفیت نہ تھی، اور ان کے اظہار کرنے میں ترتیب
نہیں دی گئی تھی، اقبال نے ان ہی خیالات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں
ایک نظم پیدا کر کے اس کو منطقیانہ ترتیب دے کر عجیب و غریب بنا دیا ہے،

(ص - ۵۴۵)

یہ کتاب خالص فلسفیانہ رنگ میں لکھی گئی ہے، فاضل مؤلف خود ایک اچھے فلسفی ہیں، اس لئے ان کے
قلم سے بکثرت فلسفیانہ اصطلاحات نکل گئے ہیں جن کا سمجھنا ایک فلسفی کے لئے تو آسان ہے، مگر عام
ناظرین کے لئے مشکل ضرور ہے، اس نے فاضل مؤلف ان اصطلاحات کی تصریحات بھی کرتے جاتے،
تو اس کتاب کے مباحث کو سمجھنے میں زیادہ وقت نہ ہوتی، خود اس راقم کو بہت سی اصطلاحات
کو سمجھنے کے لئے اصطلاحات کی ڈکشنری کا سہارا لینا پڑا، اس طرح جن یورپی مفکرین کا ذکر

اس کتاب میں آیا ہے، وہ بہت ہی مشہور و معدودت ضرور ہیں لیکن مباحث کے اندر یا آغاز میں مختصر طور
پر ان کے کچھ حالات زندگی درج کر دیئے جاتے تو کتاب کی افادیت ان کے عام ناظرین کے لئے
اور بھی بڑھ جاتی، جو ان سے بہت زیادہ واقف نہیں، یہ بزم اقبال، کلب و ڈلاہور سے شائع ہوئی
میرے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو ۱۹۶۵ء میں طبع ہوا تھا، اس وقت اس کی قیمت چھ روپے
رکھی گئی تھی، اب تو اس کی قیمت بہت بڑھادی گئی ہوگی،

ڈاکٹر ریاض الاسلام | راشد ہی صاحب کے مکان ہی پر کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام
نے اپنی ایک انگریزی تصنیف انڈیا پر سین ریٹیشنز وی اس کو بھی خالی اوقات میں پڑھا رہا، یہ
کتاب دراصل وہ مقالہ ہے، جس پر ڈاکٹر صاحب موصوف کو ۱۹۶۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے
پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی، اب یہ ایران میں کلچر فاؤنڈیشن تہران کی طرف سے بہت عمدہ لکھا
پھپھائی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس میں دست ابواب کے علاوہ گیارہ ضمیمے بھی ہیں، کتابیات
کی فہرست الگ ہے، پانچ تصویریں ہیں جن میں منل اور صفحہ می خانڈانوں کی تصویریں ہیں، ان
میں ایک جہانگیر کے دربار کے مشہور مصور کشن واس کی بھی ہے، یہ ہندوستان کے منل بادشاہوں اور
ایران کے صفحہ می حکمرانوں کے سیاسی تعلقات پر بڑی باوزن تصنیف کہی جاسکتی ہے، اس
موضوع پر قدیم و جدید، قلمی اور مطبوعہ جتنے ماخذ مل سکتے تھے، مصنف نے ان سے پورا استفادہ کیا،
منلوں کے پورے دور حکومت میں مختلف تاریخوں میں جو بکھرے معلومات تھے، وہ اس میں پوری
محنت کاوش اور تحقیق کے ساتھ یکجا جمع کر دیئے گئے ہیں، اس طرح اس موضوع کا بہت ہی
واضح مفصل اور مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے، اس کا انداز بیان کھرا اور سہرا ہے، سارے واقعات
اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ ناظرین خود ان سے اپنی رائے آسانی سے قائم کر سکتے ہیں، تحریر
میں کہیں نوک سوزن اور میش خار نہیں، آخر میں تہمت کے عنوان سے مصنف نے اپنی جس رائے کا

اظہار کیا ہے اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہادیوں سے مالگیر کے عہد تک قندھار کے لئے ہندوستان اور ایران میں بڑی آویزش رہی کبھی یمنوں اور کبھی صفویوں کے قبضہ میں آجاتا، بالآخر اورنگ زیب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفوی حکمران مغل بادشاہوں سے فوجی حیثیت سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے، اس آویزش کے باوجود یہ پہلو بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے کہ دونوں ملکوں کے حکمران اپنے سفر ازیح کر باہمی خوشگوار تعلقات بھی قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے، گو ایران کی لچائی نظر ہندوستان پر برابر پڑتی رہی بعض صفوی حکمران تو ہندوستان پر حملہ آور بھی ہونا چاہتے تھے، شاہ عباس ثانی نے تو مراد زار اسکوہ اور دکن کی ریاستوں کی پاسداری کر کے ان کو اورنگ زیب کے خلاف ابھارنے کی بھی کوشش کی، اس طرح اورنگ زیب نے اپنے دو بھائیوں اور دکن کی ریاستوں کے خلاف جو روش اختیار کی تھی اس کا تجزیہ اس روشنی میں بھی کرنے کی ضرورت ہے، ایران کے دبے ہوئے سیاسی جذبات نادر شاہ کے بے سود اور لا حاصل حملے میں ظاہر ہوئے، جس کے ساتھ ایک خونی آرتخ دا بستہ ہو کر رہ گئی ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے کہ مغل حکومت کے عروج کے عہد میں تمدنی اتھذیبی اور ثقافتی حیثیت سے ہندوستان اور ایران ایک گھر کے دو صحن بنے ہوئے تھے، ایرانی اثرات آج بھی ہندوستان میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، مگر مصنف کی کتاب کا یہ موضوع نہیں تھا، اس لئے اس پر کوئی سیر حاصل بحث نہیں، نویں باب میں اس پر ایک سرسری نظر ڈال دی گئی ہے، مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس عنوان سے بھی ایک اچھی اور باوزن کتاب تیار کی جائے۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام نے اپنی اس کتاب کے ساتھ مناسبات حسن خاں شالوکا کا بھی ایک نسخہ دیا ہے جس کو انھوں نے برٹش میوزیم سے حاصل کر کے اڈٹ کیا ہے، اور انسٹیٹیوٹ آف سنٹرل

اینڈ ویٹ ایشین اسٹڈیز کراچی یونیورسٹی سے شائع کیا ہے، جس کے وہ سکریٹری بھی ہیں، اس کے نفضل مرتب کا خیال ہے کہ یہ ایرانی سفارتی خط و کتابت کا ایک بڑا ماخذ ہے، مگر وہ اس کے مصنف کے تصدیق کرنے میں خود کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، اس میں ۳۶ مکتوبات جو ایران کے شاہ صفی اور شاہ عباس کے عہد میں ہرات کے گورنر اور خراسان کے بیگ لاکھی حسن خاں شالوکا اور عباس قلی خاں شالوکا کی طرف سے توران کے خوامین اور مختلف شخصیتوں کے نام لکھے گئے تھے، دو مکتوب جہانگیری عہد کے امیر نفل خاں حاکم کشمیر کے نام سے بھی ہیں، یہ مجموعہ ۱۶۳۹ء کے بعد مرتب ہوا، نفضل مرتب اس کی انشا پر دازانہ تحریر سے بھی متاثر نظر نہیں آتے، بلکہ اس کو آدرو سے بھری ہوئی شکل قرار دیتے ہیں، اس مجموعہ کی افادیت پر بھی ان کا قلم زیادہ نہیں چل سکا ہے، البتہ اس کے شروع میں بننا سبت جشن دو ہزار و پانصد سی شاہنشاہی ایران درج ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایران کو طرف پاکستان کے صرف علمی خیر سگالی کے جذبہ کے انظار کے لئے اس کو اڈٹ کر کے شائع کیا گیا ہے، اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ اس کے مرتب نے ایسا مجموعہ بھی تیار کر لیا ہے جس میں ہندوستان اور ایران کے سفارتی خطوط ہوں گے، یہ اس برصغیر کے علمی حلقہ کے لئے نسبتاً زیادہ مفید کام ہوگا۔

اقبال اکیڈمی کے مہر ستمبر کو پاکستان کے مشہور ادارہ اقبال اکیڈمی میں ایک علمی نشست تھی جس میں علامہ ڈاکٹر اقبال پران کے ایک ہم جلس جناب شوقی امرت سری صاحب اپنا ایک مقالہ پڑھنے والے تھے، اس کے ڈاکٹر ڈاکٹر مغزالدین نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھ کو بھی بلایا، جناب ظفر احسن صاحب معتمد اعزازی بیڈل اکیڈمی خاص طور پر میری قیامگاہ پر آئے اور مجھ کو وہاں لے گئے، وہاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری جناب سید الطاف بریلوی اور پاکستان کے بہت ہی پاکیزہ ذوق رکھنے والے شاعر اور فاران کے اڈیٹر ماہر نقاد سیدی سے

من کربڑی سرت ہوئی، دونوں حضرات بڑی محبت سے پیش آئے، اسی مجلس میں ڈاکٹر عبد الواحد سے تعارف ہوا، ان کا آبائی وطن اجیر تھا، ام۔ اے۔ اے۔ اے۔ کالج علی گڑھ سے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے۔ سی کیا، پھر آکسفورڈ جا کر مزید تعلیم حاصل کی، ۱۹۵۵ء میں جنگلات کے انسپکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، اقبالیات کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں، ان ہی نے پیام مشرق اور اسرار خودی کا ترجمہ عربی میں کر لیا، جس کے لئے ہر ہائی نس آغاخان نے سرمایہ دیا، ان ہی کی مساعی سے اقبال کی بعض نظموں کے ترجمے اطالوی جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ہوئے اور انھوں نے انگریزی میں اقبال پر حسب ذیل کتابیں لکھیں۔

- (1) Iqbal: His art and thought
- (2) Studies in Iqbal
- (3) Glimpses of Iqbal
- (4) Thoughts and Reflection of Iqbal
- (5) Introduction To Iqbal

اور میں باقیات اقبال اور مقالات اقبال بھی مرتب کی ہیں، جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو جناب شوق امرتسری نے اپنا مقالہ پڑھا، جو بہت محنت اور خوش سلیقگی سے لکھا گیا تھا، اس کے زیادہ تر حصہ میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نہ سوشلسٹ تھے، نہ وحدت الوجودی، نہ سوشلسٹ تو یقیناً کسی مکانا سے نہ تھے، البتہ جب فاضل مقالہ نگار یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ وحدت الوجودی نہ تھے، تو میرے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ اگر وحدت الوجود عشق الہی کی سرشاری اور دار فکری سے مراد ہے تو ڈاکٹر اقبال وحدت الوجودی نہ تھے، حضرت شرف الدین عینی منیری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی حضرت اشرف ہاشمی گنگوہی سہنائی اور آخری دور میں شاہ ولی اللہ وحدت الوجود کے قائل رہے تو ڈاکٹر اقبال کی

اس کے منکر ہو سکتے تھے، عام خیال یہ ہے کہ وحدت الوجود کے حامی اسلامی شریعت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، مگر یہ بزرگان دین تو وحدت الوجود کے قائل ہونے کے ساتھ اتباع شریعت کا بڑا سکاٹہ رکھتے، حضرت شرف الدین عینی منیری فرمایا کرتے کہ شریعت کے بغیر راہِ طہقت میں غرور، جہل، پندار اور حق پیدا ہو جاتا ہے، جس کے بعد شیطان و رنلا کر ایمان برباد کر دیتا ہے، حضرت اشرف ہاشمی گنگوہی کا عقیدہ تھا کہ اولیاء اللہ فنا فی اللہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ ظاہراً باطناً، قولاً فعلاً اور حالاً حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیح نہ ہوں، حضرت عبد القدوس گنگوہی کا قول ہے کہ جو وحدت الوجود کے ساتھ کفر و اسلام، امر و نہی، ثواب و عذاب، رحم و قہر اور نبوت کے قائل ہیں وہ تو صوفیہ ہیں اور جوان چیزوں کے قائل نہیں ہیں وہ سفسطائیہ ہیں، وہ سفسطائیوں کو خارج از اسلام قرار دیتے ہیں، شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ ان کے چچا شاہ ابوالرضا وحدت الوجود کے قائل تھے مگر اپنے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں شریعت کی پابندی کا اہتمام کرتے، حتیٰ کہ سنت بنوسی کی پیروی میں جب مسجد کے قریب پہنچتے تو گھر سے ہو جاتے، پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے، پھر دایاں پاؤں بڑھا کر مسجد میں داخل ہوتے، اگر وحدت الوجود کے حایوں کا یہی شیوہ اور مسلک رہا، تو پھر ڈاکٹر اقبال کیسے اس کے مخالف ہو سکتے تھے،

خیال آیا کہ ڈاکٹر اقبال کی کتاب ایران میں نابعد الطبیعیات کا ارتقاء امدان کی اسرار خودی میں ان کے ایسے خیالات کا وجود ضرور ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے نظریہ کو پسند نہ کرتے تھے، وہ واقعی ایسے وحدت الوجود کو تسلیم نہیں کرتے، جو مسلمانوں کو ذوقِ عمل سے محروم کر کے ان میں رجائیت کے بجائے تنویطیت پیدا کرے، اور ان کو اس راہ میں جو بخود حاصل ہو اس سے وہ مذہب و اخلاق سے بیگانہ اور شرعی پابندیوں سے آزاد ہو کر زندگی گزارے

یاد رہا نیت پر عمل کر کے فرار اور گریز کو اپنا شیوہ بنالیں، یہ وحدت الوجود کا بگڑا ہوا منظر یہ ہے جس کے حامی ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، نیکی و بدی، ثواب و عذاب کی تفریق مٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں، اگر ایسے وحدت الوجود کا رشتہ اسلام سے منسلک نہیں کیا جاسکتا، ڈاکٹر اقبال کو ایسے ہی وحدت الوجود سے اختلاف رہا ہو گا، شیخ ابن العربی وحدت الوجود کے بہت بڑے حامی سمجھے جاتے ہیں، ڈاکٹر اقبال پہلے تو ان کے معترف نہیں تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ابن عربی نے اپنے نظریہ وحدت الوجود کو قرآن وحدیث سے ہٹ کر ایک فلسفہ بنا دیا ہے، لیکن ڈاکٹر اقبال کے غور و فکر کی گہرائی جیسے جیسے بڑھتی گئی، وحدت الوجود کے متعلق بھی ان کا خیال بدلتا گیا، اور وہ وحدت الوجود کے فطری نظام کو قرآن اور حدیث ہی کے مطابق تصور کرنے لگے، ان کی گلشن راز جدید، مذہب اور عجم، جاوید نامہ، بال جبریل، ضرب کلیم ما فریب سے پاید کرد اور ارمنان جہاز میں ایسے اشعار ملیں گے جن سے ظاہر ہو گا کہ جب وہ حقیقی وحدت الوجود سے آشنا ہوئے، تو اس نظریہ سے ان کی مخالفت جاتی رہی، بال جبریل کا ایک شعر ہے،

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہان میں باقی ہے نمودِ سیمیا بنی
ضرب کلیم میں ہے،

خود ہوتی ہے زمان و مکاں کی زتاری

ہے زمان نہ مکاں لا الہ الا اللہ

ابن عربی بھی بے خودی کے ذریعہ سے خدا تک پہنچنے کی تعلیم دیتے ہیں، اقبال بھی خودی کے ذریعہ سے خدا تک پہنچنے کی تلقین کرتے ہیں، دونوں کی منزل ایک ہے، گورانی کچھ مختلف ہیں، لیکن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب اقبال اور اس کا عہد میں اس موضوع پر

بہت اچھی بحث کی ہے، جس سے مجھ کو پورا اتفاق ہے،

یہی ساری باتیں ذہن پر چھائی ہوئی تھیں کہ جناب شوق صاحب نے اپنا مقالہ ختم کیا، ڈاکٹر

معز الدین نے فاضل مقالہ نگار سے سوالات کرنے کو کہا، کچھ سوالات وجوہات ہوئے، پھر ڈاکٹر

معز الدین نے یکایک مجھ کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کو کہا، میرا جی چاہا کہ میں اب تک جو کچھ

سوچ رہا تھا، اسی کو کہہ ڈالوں، مگر میرے پاس ہی جناب ماہر القادری بیٹھے تھے، وہ وحدت الوجود

کے مخالف ہیں مجھ کو خیال آیا کہ یہ تنازعہ فیہ بحث کیوں چھیڑی جائے، اس لئے اس کو نظر انداز کر کے

میں نے اقبال سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے اہل علم و عہد سلیمان

دروسی اقبال کے بہت قائل تھے، اپنی نجی صحبتوں میں ان کی فکر و نظر کی تعریف برابر کرتے رہتے تھے،

جب ان کی وفات کی خبر سنی تو رنج و اضطراب میں ویر تک ٹپتے رہے، اس کے بعد معارف میں

جو تذرات لکھے، وہ ان کی بہترین انشا پر داندہ تحریروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں، اس

میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول، شاعر فلسفہ، اسلام کا ترجمان اور

کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید یہ صدیوں کے بعد پیدا

ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ در، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل

کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کی ہر پردہ اذبال جبریل تھا، اس کی فانی عمر ختم ہو گئی،

لیکن ان کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشا راشد باقی رہے گا،

اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کیا کہ ڈاکٹر اقبال بھی سید صاحب کے بڑے معتقد تھے، ان کو

اپنے ایک مکتوب میں جو سیر اسلامیہ کا فریاد کہا، اور ان سے علمی ادبی اور مذہبی مسائل

میں مشورے کرتے رہے، اور جب سید صاحب ڈاکٹر اقبال اور اس مسعود نادر شاہ کی دعوت

پر افغانستان گئے، تو دونوں اس سفر میں اور بھی ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے، ایک رو

یہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری باقی ہے ہندوستان میں اسلام باقی رہتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا نہیں جب تک ہندوستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات باقی رہیں گی، ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا، اس مسودے دونوں کو روک کر کہا کہ یہ کیوں نہ کہا جائے، کہ جب تک ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین کا لٹریچر ہندوستان میں باقی رہے گا، یہاں اسلام بھی باقی رہے گا، یہ سن کر دونوں ہنس پڑے،

یہ بھی عرض کیا کہ دارالمصنفین نے بھی اقبال کی خدمت اقبال کا مل شائع کر کے کی ہے، مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور ہندوستان کے مشہور ادیب جناب رشید احمد صدیقی صاحب نے کئی بار مجھ سے کہا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اقبال اسی اقبال کا مل کے ذریعہ سے سمجھے جاتے ہیں، اس کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے اقبال کے پیام اور فلسفہ کو جس واضح اور صاف انداز میں سمجھایا ہے کوئی اور نہ سمجھا سکتا ہے،

اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ اس وقت ہمارے ملک ہندوستان میں اقبال کی عظمت کا اعتراف ہر طرف سے ہو رہا ہے، جناب اکبر علی خاں صاحب جب یو۔ پی۔ کے گورنر تھے، تو انھوں نے اقبال پر ایک بہت ہی اچھا مقالہ لکھا، جو اخباروں میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا، ہمارے مرکزی حکومت اقبال کا سنہ سالہ جشن پورے اہتمام کے ساتھ منانے والی ہے، اس کے لئے مختلف کمیٹیاں بھی بنائی گئی ہیں،

پھر یہ بات پورے دثوق کے ساتھ کہی کہ اس برصغیر میں اقبال کا سب سے بڑا پرستار اگر کوئی ہے تو وہ جگن آتھ آزاد ہیں جو اردو کے مشہور شاعر بھی ہیں، اور اس وقت حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے بڑے عہدیدار بھی ہیں، وہ اقبال کی ہر چیز سے عشق رکھتے ہیں، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کی نظم قرطبہ سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کو قرطبہ دیکھنے کا شوق ہوا وہ وہاں گئے، اور جس جگہ

ڈاکٹر اقبال نے دعا مانگی تھی، وہ بھی ڈھونڈ ڈھونڈ نکالی، اور پھر وہاں کی مسجد کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ اقبال نے اس کے دروہام میں ان عظیم شخصیتوں کے کردار کو جلوہ گرد دیکھا جن کے عزائم نے یہ مسجد تعمیر کی، وہ میونخ بھی گئے، جہاں ڈاکٹر اقبال نے تعلیم پائی تھی، انھوں نے ڈاکٹر اقبال پر ایک نمائش بھی مرتب کر رکھی ہے، جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں بڑے شوق سے دکھائی دیتے ہیں، وہ دارالمصنفین آئے، تو انھوں نے اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط کا ایک مجموعہ دیکھا تو ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی، کیونکہ اس سے پہلے ایک ساتھ اقبال کے تین خطوط ان کی نظر سے نہیں گذرے تھے، تہذیب مانع نہ ہوتی تو وہ خوشی میں رقص کرنے لگتے، اب وہ اس مجموعہ کا فوٹو اسٹیٹ نسخہ شائع کرنے والے ہیں، وہ اقبال پر برابر مضامین لکھ رہے ہیں، بڑی جرأت کے ساتھ وہ اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ اقبال پر الزام ہے کہ وہ مذہبی اور اسلامی شاعر تھے، مگر یہی ان کا سب سے بڑا وصف ہے، جس سے وہ محروم نہیں کئے

جاسکتے،

دنیا کے بہت سے بڑے شاعروں نے مذہب کو اپنا موضوع بنایا ہے، ویسا، وایکی، دانٹے، ملٹن اور گیتے تو مذہبی شاعر ہی تھے، مگر ان کے شاعرانہ کمالات سے کون انکار کر سکتا ہے،

جگن آزاد کا خیال ہے کہ اقبال کے خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کے خیالات کی عظمت سے انکار ممکن نہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ انسانیت کی بلندی سے کہی ہے، وہ صرف مقصد کی عظمت ہی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے حصول کے لئے طریق کار کی عظمت کے بھی قائل ہیں، عظمت کے اس تصور نے ان کی شاعری کو ایک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بخشی ہے،

جنگ نامہ آزاد کا خیال ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال وطنیت کے خلاف تھے، وہ ان کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے، اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی وطنی نظموں میں اسلام کا ہمہ گیر نظریہ موجود ہے، اور ان کے اسلام کے ہمہ گیر نظریوں میں وطنیت پائی جاتی ہے، مگر یہ بات صرف غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی ظاہر ہو سکتی ہے، مگر وہ اس نیشنلزم کے ہرگز قائل نہ تھے، جس پر آج کل کی سیاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے، لیکن نامہ آزاد کا خیال ہے کہ اقبال کو اسلامی شاعر کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ ڈانٹے اور ملٹن کو عیسائی شاعر نہیں کہا جاتا ہے، کالیڈس ہنسی تھی اور میگور، ہندو شاعر نہیں کہلاتے، اقبال نے اسلامی تعلیمات ضرور پیش کی ہیں، مگر اس تعلیم کے ذریعے پیش کیا ہے کہ انسان عظیم ہے، اور جاوہر عظمت پر گامزن ہے، ان کے پورے کلام کو صحیفہ عظمت آدم کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے،

میں نے آخر میں یہ کہا کہ اگر اقبال کو اسلامی شاعر ہی تسلیم کر لیا جائے تو وہ مسلمانوں کو جذبہ لم یزل کا دست قدرت اور زبان دیکھنا چاہتے تھے، اور انھوں نے ان کا مقام چرخ نبی نام سے پرستین کیا تھا، کیا پاکستان کے مسلمان ان کے اس پیام پر عمل کر رہے ہیں،

یہ سب کچھ مگر ٹھیک تو ڈاکٹر معز الدین میرے پاس آئے اور بولے کہ جو کچھ آپ نے اس وقت کہا ہے وہ قلمبند کر دیں، تاکہ یہ اقبال ریویو میں چھپ جائے، مگر کراچی کے قیام میں اسکو قلمبند کرنے کی فرصت نہ ملی، اقبال کے بعد ڈاکٹر معز الدین نے اقبال اکیڈمی کے بنگلانہ کی سیر کرائی، یہ اس کی اپنی عمارت نہ تھی بلکہ کراچی کی تھی اس زمانہ میں یہ اکیڈمی لاہور منتقل ہو رہی تھی اسلئے اس کا سارا سامان بندھا چڑھا تھا، مگر اسکی بطوغات کی فہرست دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے اب تک اقبالیات پر دو انگریزی، ہندھی، گجراتی، پشتو، بنگالی، ترکی، عربی اور عربی میں، ہ کتابیں نکل چکی ہیں، ڈاکٹر معز الدین نے لاہور پہنچ کر دانشمندیوں کو اس اکیڈمی کی تمام مطبوعات پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا، مگر واپسی میں لاہور میں نہ ٹھہر سکا، اس لئے یہ کتابیں نہ مل سکیں،

(باقی)

علم الاخلاق اور فارسی نثر کی اخلاقی کتابیں

از ڈاکٹر محمد شرف عالم لکچرار، بی این کلج، پٹنہ، بیہار، انڈیا

علم الاخلاق یا اخلاقیات انسانی عادات و اطوار اور آداب و رسوم کی جانچ کی وہ کسوٹی ہے، جس پر انفرادی اور اجتماعی حرکات و سکنات کو پرکھ کر خیر و شر کا تعین کیا جاتا ہے، پروفیسر ابراہیم اپنی کتاب تاریخ اخلاقیات میں اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

”جو علم ایسے اصول بتاتا ہو جن سے انسانی کردار کے صحیح مقاصد کی حقیقی اور سچی قدر و

قیمت کا تعین ہو سکے، اس کا نام علم اخلاق ہے“

ماہر نفسیات نفس کی صلاحیتوں کے امکانات کی تحقیق کرتا ہے، اور علم اخلاقیات ان صلاحیتوں کے استعمال کے طریقوں کی توضیح کرتا ہے، وہ انسانی افکار و اعمال کا صرف مطالعہ ہی نہیں کرتا، بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ انہیں کیسا ہونا چاہئے،

مذہب و عقل دونوں نے اس علم کو محترم و محبوب قرار دیا ہے، ابتدا میں مذہبی پیشواؤں، مصلحوں اور رہنماؤں نے اور پھر فلسفیوں نے اخلاقی احکام و ادوار، قواعد و ضوابط اور نپند و نصیحت کو اپنے ہمد کے ذہنی معیار کے مطابق عوام کے سامنے پیش کیا، یونان میں اخلاق کی روح کو فلسفہ کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کا اولین شرف سوفسطائیوں (۴۰۰-۳۵۰ ق م) کو حاصل ہے، پھر سقراط (۴۷۰-۳۹۹ ق م) نے ان مباحث کو وسعت دی، سقراط کو علم اخلاق

لے تاریخ اخلاقیات، پروفیسر ابراہیم لکچرار، از احسان احمد جامعہ عثمانیہ،

کابانی و موسس قرار دیا جاتا ہے، اس کے شاگرد حکیم فلاطون کے مکالمے اور مباحثے بھی محفوظ ہیں، جو اعلیٰ علمی اور اخلاقی قدروں کے حامل ہیں، ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) نے علم اخلاق کو ایک مذہب و مدون علم کی حیثیت سے پیش کیا، اسکی مشہور تصنیف "علم اخلاق" اس کا مین ثبوت ہے، علم اخلاق اور سیاست میں پہلے خلط ملط تھے، ارسطو نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ پیش کیا، لیکن ایک دوسرے کو لازم و ملزوم قرار دیا،

فلسفہ یونان کے بعد علم اخلاق کو پھر مذہب کی امان میں آنا پڑا، نصرانیست، عیسائیت اور اسلام نے اس کی بنیاد وحی الہی کے احکام پر رکھی، جب مذہب اسلام کے علمی دور کا آغاز ہوا اور خلافت بغداد اور خلافت قرطبہ کے زیر سایہ علوم و فنون نے ترقی کی منزلیں طے کیں تو بعض علماء نے علم اخلاق کو بھی عقل و نقل کی نگاہ سے پرکھا، فلسفی علماء کی ایک جماعت نے عقل کی اساس پر احکام مذہبی کو منطبق کرنے کی سعی کی، فلسفیوں کی اس جماعت میں فارابی، ابن مسکویہ اور ابن سینا وغیرہ قابل ذکر ہیں، علماء کی دوسری جماعت نے مذہب کو اخلاقی مسائل کی اساس قرار دیا، ایسے ان کے افہام و تفہیم کے لئے عقل کو ایک آلہ کی حیثیت سے استعمال کرنے کی اجازت دی اور یہ ممکن بنایا۔

علم اخلاقیات کو عقل و نقل کی نگاہ سے پرکھنے والے اور احکام مذہبی کو اساس عقل پر منطبق کرنے والے فلسفیوں میں ابوالنصر محمد بن محمد بن اوزنغ نے بن طرخان فارابی (متولد ۲۵۹ء موافق ۳۳۰ھ مطابق ۶۹۵ء) کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے، میدان فلسفہ و حکمت میں فارابی کو مکتب ثانی بھی کہتے ہیں، صورت خراسان کے شہر فارابیاب کے رہنے والے اس فلسفی نے علم اخلاق پر درج ذیل تالیفات یا نوکلاں چھوڑی ہیں، (۱) التنبیہ علی سبیل السعادة (۲) تحصیل السعادة (۳) صدر

کتاب اخلاق لارسطو، آخر ان کے تالیفات کے بارے میں اسٹین ٹینڈر کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب

کا ذکر متعدد یہود و فلاسفہ کی کتابوں میں دیکھ کر عبرانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا، اخلاقیات کے موضوع پر مذکورہ تالیفات کے علاوہ بھی کئی اور رسالے فارابی سے منسوب ہیں، سیاست مدن پر فارابی کی اہم تالیف آراء اہل المدینہ، نفاصلہ کے علاوہ کتاب الالفاظ الافلاطونیہ و تکوین سیاست الملکویہ و اخلاق اور کتاب سیاست المدینہ الملقب بہ مبادی الموجودات وغیرہ بھی دستیاب ہیں،

فارابی نے اپنی تالیفات میں یہ ثابت کیا ہے کہ خیر و شر کے امتیاز کے لئے صرف عقل کافی ہے اور عقل جو انسان کو خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہے، اسی کا کام ہے، کہ حکم راہ راست بتائے، فارابی کے فلسفہ کی بنیاد ارسطو کا فلسفہ اور افلاطونی فلسفہ ہے، اس کے فلسفہ کو نو افلاطونی اسلامی فلسفہ کا نام دیا جاسکتا ہے، قرآن اور فلسفہ دونوں پر فارابی کا عقیدہ واضح تھا، اس نے معلم اول ارسطو کی کتابوں کی ترتیب پیش کی، اپنی تالیفات میں کہیں وہ افلاطون کی ہم نوائی کرتا ہے اور کبھی ارسطو کا ہم خیال ہو جاتا ہے،

فارابی نے اپنی تحریروں میں لغو سے زیادہ معنی پر توجہ کی ہے، اس کا طرز بیان پیچیدہ ہو گیا ہے، جدید ایران کے ایک صاحب علم علی اکبر محقق کا کہنا ہے کہ اس کا طرز بیان پیچیدہ ہو گیا ہے، جدید ایران کے ایک صاحب علم علی اکبر محقق کا کہنا ہے کہ اس کا طرز بیان پیچیدہ ہو گیا ہے۔

جملات شیطانی و عبارات آتش نارسا اس کے جملے طویل اور عبارات نارسا ہیں، اسناد و جہت سے اس کے مقاصد کا سہل و آسان نیست بلکہ بے اندازہ پیچیدہ است، عبارات تالیفات شریک و سپس نیست و از زیبائی ادبی ای نذاردی

بے بہرہ ہیں!

۱۔ فارابی ^۱ از میں احمد جعفری نے تاریخ فلاسفہ اسلام از محمد علی جوادی نے ^۲ تالیف کے مجلد ہفتم میں ^۳ کا ذکر ہے کہ وہ فلسفہ اخلاق اور ^۴ علوم انسانی دانش گاہ آذربایجان، مقالہ از علی اکبر محقق ^۵ شمارہ ہمارے ۱۹۸۰ء

لیکن اس کے باوجود شیخ الرئیس بڑی سینا فارابی کی قدر و منزلت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے،
 ابو نصر فارابی کیلئے دروازہ شہر علم را
 باد دادہ د از برکات انقاس قدسی
 ابو نصر فارابی نے شہر علم کے دروازہ کی کوئی
 انھیں عطا کی اور ان کی تالیفات نفس
 اور انقاس قدسی کی برکات سے ان کی
 روح نے فتوح حاصل اور ان کے درختان
 واز کلمات گہر بار و درختان او استفا
 منودہ است،
 اور گہر بار کلمات سے استفادہ کیا،

عظیم اخلاق پر عقلی و نقلی بحث پیش کرنے والا سب سے بڑا مفکر ابو علی خازن احمد بن محمد بن یعقوب
 الملقب بہ ابن مسکویہ (متوفی ۴۲۱ھ بمطابق ۱۰۳۰ء) ابن مسکویہ خاندان آل بویہ کے فاتح بغداد
 شہزادہ معزالدولہ کے وزیر المہلبی کا سکریٹری تھا، وہ شیراز اور رے میں لائبریرین کے عہدہ پر فائز
 رہ چکا تھا جہاں اس نے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے، اسے عربی کے معروف عالموں اور مورخوں میں
 شمار کیا جاتا ہے، ابن مسکویہ کو خاندان آل بویہ کے حکمرانوں بالخصوص عضد الدولہ کے دربار میں بڑا قرب
 حاصل تھا، فن اخلاق میں اس کی شہرہ آفاق تالیف "تہذیب الاخلاق و تظہیر الاعراق" کو قبول خاص
 عام حاصل ہوا، ڈونالڈ سن اس کتاب کی اہمیت و افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ
 اسلامی ادبیات میں فلسفہ اخلاق پر یہ اہم ترین کتاب ہے، چھ مقالات پر مبنی اس کتاب میں
 ابن مسکویہ نے بہت زیادہ قوت فکر اور زور قلم صرف کیا ہے اور حکمائے یونان افلاطون، ارسطو
 اور ارسطو کی تعلیمات کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ آمیز کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے
 مباحث میں ارسطو نے تالیفات و تعلیمات کے اخلاقی اجزاء کا غلبہ نظر آتا ہے، اس کا فلسفیانہ
 لہجہ شہرہ آفاق، ادبیات و علوم، انسانی دانش گاہ آف آبادگان، شمارہ بہار ۱۹۶۷ء مطابق
 ۱۹۶۷ء ص ۱۷، اسے اردو زبان میں شیکس،

سلک ارسطو جیسی ہے، اور وہ متقدمین و معاصرین و متاخرین فلاسفہ کی طرح یونانی فلسفہ کو
 بہت اہمیت دیتا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اپنی کتاب تاریخ فلاسفۃ الاسلام میں ارسطو کے ساتھ ابن مسکویہ
 کے تعلق کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

ابن مسکویہ نے معلم اول ارسطو کی عظمت و شان کو اس درجہ بلند کیا کہ اسے قابل پرستش بنا دیا،
 ابن مسکویہ نے مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ علم اخلاق کے موضوع پر ایک اور تالیف جاویدان اکلمہ الخالہ
 کے نام سے قلم بند کی ہے، ماخذ قدیم پر مبنی اس کتاب میں ایران، پاکستان کے اقوال بزرگان کو ہندی
 فارسی، رومی اور اسلامی حکمتوں کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، ابن مسکویہ کی اس کتاب کی بنیاد قانون اکلمہ
 والدستور ہے، انسانی روایت کے مطابق ایران، پاکستان کے بادشاہ ہوشنگ کی وصیتیں اس کتاب
 میں درج ہیں شاہ ہوشنگ کا مخاطب اس کا بیٹا ہے، ابن مسکویہ نے ان مضامین و مطالب کو شرح
 و بسط کے ساتھ اپنی تالیف میں بیان کیا، یہ کتاب ایک بار شہنشاہ جہانگیر کے معاصر تھی اللہ بن محمد بن
 شیخ محمد ارجانی نسترگاہ کے ذریعہ جاویدان خرد کے نام سے اور دوسری بار شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر
 کے ایک معاصر شمس الدین محمد حسین حکیم (متوفی ۱۱۰۵ھ) کے ذریعہ انتخاب شایستہ خانی کے نام سے فارسی
 زبان میں ترجمہ ہوئی، ابن مسکویہ سے پہلے عہد اسلامی کے ایک مولف ابو الحسن محمد بن یوسف
 عامری نیشاپوری (متوفی ۳۸۱ھ) نے جاویدان خرد کا ذکر کیا ہے، اور اپنی تالیف کتاب السعادت
 والاسعاد فی السیرۃ لادانیہ میں اسے ایرانیوں کی ایک عمدہ کتاب تسلیم کیا ہے،

ابو علی حسین بن عبد اللہ بن حسن بن علی بن سینا الملقب بہ شیخ الرئیس (متولد ۳۷۰ھ مطابق
 ۹۸۰ء متوفی ۴۲۸ھ) نے صنف اخلاقیات میں دو جلدوں پر مشتمل کتاب "البر والاثم" تالیف
 لے صاحب کشف الفطنون نے لکھا ہے کہ اس کتاب کو مامون الرشید کے وزیر حسن بن سهل نے فارسی سے عربی میں
 منتقل کیا، اور اس کا خلاصہ بھی کیا، ابن مسکویہ نے اس خلاصہ کو اپنی کتاب ادب اللوہی انفرس کے مقدمہ میں درج کیا و معارف

کی شیخ رئیس کی مذکورہ تاریخ ولادت و وفات محمد لطفی جمعہ نے اپنی تالیف تاریخ فلاسفۃ الاسلام میں تحریر کی ہے، لیکن سید بسلا نے ان تاریخوں سے قدرے اختلاف کیلئے، وہ لکھتے ہیں، شیخ کی پیدائش تیسری صفر ۳۷۳ھ کو اور روایت صحیح کے مطابق ۳۷۳ھ میں مقام خرمین میں ہوئی اور سال و ہجرت ۲۲۶ یا ۲۲۷ھ میں ڈاکٹر ذریعہ اندھنفا کی تحقیق کے مطابق سال ولادت ۳۷۰ھ مطابق ۹۰۰ عیسوی ہے۔ اس بیان سے محمد لطفی جمعہ کی تحقیق درست معلوم ہوتی ہے، سید جلال کی ایک اور تحقیق شیخ رئیس کے سلسلہ میں دہلی سے خانی نہ ہوگی انھوں نے شیخ رئیس کی ایک سو اسی حیات لکھی ہے اپنی اس تالیف کا نام تذکرہ معلم ثانی حکیم ابو علی شیخ رئیس شرف الملک حسین بن عبداللہ بن حسن بن علی بن سینا رکھتا ہے حالانکہ دیگر مورخین نے اس کو معلم اول اور فارابی کو معلم ثانی کا لقب دیا ہے، تاریخ ادبیات میں بھی یہاں مذکور ہے گذشتہ سال (۱۹۷۵ء) مجلہ دانشگاہ ادبیات و علوم انسانی کا شمارہ بہار ۱۳۵۲ھ ش (شمارہ مسلسل ۱۱) ابو نصر فارابی کی یاد میں خاص نمبر کے طور پر شائع ہوا اور اس سے پہلے ۱۳۵۳ھ میں ش مطابق ۱۹۷۲ء میں ایران کی یونیورسٹیوں اور موسسات آموزش و پرورش میں ابو نصر فارابی معلم ثانی کی یاد میں کانفرنسیں سینا راؤ پیوزیم منعقد ہوئے تھے، ان کانفرنسوں میں فارابی پر بڑے بڑے پرمغز اور تحقیقی مقالات پڑھے گئے اور طبع ہوئیں اور ان کے آڈیو ڈاؤن لوڈنگ میں منعقدہ کانگریس میں پڑھے گئے اس قسم کے دو تحقیقی مقالات مجلہ مذکورہ کی زینت ہیں۔

شیخ رئیس ابو علی سینا نے ابو الحسن عروسی کی درخواست پر کتاب مجموع تالیف کی اس کتاب میں علم ریاضی کے علاوہ دیگر تمام علوم نہایت شرح و بسط کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں، شیخ ابو بکر برقی خوارزمی نے جو خود بھی فہم اور تفسیر کا بڑا عالم تھا، شیخ رئیس سے التماس کی کہ علم اخلاق میں کسی کتاب کی تالیف کریں، چنانچہ کتاب البر والاثم معرض وجود میں آئی، ابن خلکان کے مطابق کتاب کی

لئے تذکرہ معلم ثانی شیخ رئیس ابو علی سینا سید جلال کے گینتہ سخن ص ۲۴۰ از ڈاکٹر ذریعہ اندھنفا

تالیف کے وقت شیخ کی عمر صرف بائیس سال تھی، شیخ رئیس کے ادبی شہ پاروں کا ایک حصہ نظریات نامہ کے نام سے مشہور ہے، اس کتاب کا مضمون بزرگمہر کے اقوال و نصائح پر مبنی ہے، ڈاکٹر ذریعہ اندھنفا کی رائے ہے کہ یہ کتاب دراصل پہلوی زبان میں تھی، جو نوح بن منصور سامانی کے حکم سے فارسی میں منتقل ہوئی، اور بعد میں بہت سی کتابوں کے ساتھ یہ بھی ابن سینا کے نام سے منسوب ہو گئی، اخلاق و سیاست کا موضوع فارسی زبان کے ادیبوں کے درمیان خاص اہمیت کا حامل رہا ہے عربی زبان میں اس موضوع پر کتابیں لکھنے کا سلسلہ تمدن اسلامی کے زیر اثر کچھ زیادہ رہا، اس موضوع پر عربی تالیفات کے ماخذ عربی کے علاوہ ایرانی اور دیگر زبانیں رہیں، فارسی زبان میں اس موضوع سے متعلق تالیفات، ترجموں اور مقدمات کے ماخذ ایک تو قدیم ایرانی زبانیں انخصوص پہلوی زبان و ادب ہیں اور دوسرے ایرانیوں کی وہ کتابیں ہیں جو عربی میں منتقل ہو چکی ہیں یا پھر مواعظ و نصائح، آداب و رسوم، تمدن و معاشرت، علم و حکمت اور فلسفہ و ادب کا وہ ایرانی کتابیں ہیں جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر تالیف ہوئیں، جبرستان کے بادشاہ گنٹشپ شاہ نے شہنشاہ اردشیر بابکان کے آغاز حکومت کے ایام میں اطاعت و باجگذاری قبول کرنے کے سلسلہ میں چند سوالات کیے تھے، اردشیر کے جوابوں نے ان کے آداب مرتب کیے تھے، پہلوی ادبیات میں یہ بہت معروف تھے، ابن المقفع دمشق ۲۵۵ھ مطابق ۷۷۰ء نے عربی میں ان کا ترجمہ کر دیا تھا، بعد کو اس نوشتہ کا پہلوی نسخہ دیگر بے شمار لکھی گئی کے ساتھ دستبرد زمانے کی بزد ہو گیا، لیکن عربی نسخہ اتفاقاً خواندم میں محمد بن حسن بن اسفندیار عربی ابن اسفندیار کے پاس محفوظ نظرہ گیا، اس نے اس کا صحیح فارسی میں ترجمہ کیا، جو طبع ہو چکا ہے، اس کے فرانسیسی اور انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

اس موضوع پر ایک بہت ہی معروف و مقبول کتاب قابوس نامہ ہے جس کی افادیت و

اہمیت پر روشنی ڈالنے ہوئے ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں۔

باید آں را از نامت کتب فارسی و یکی از
بہترین آثار معروف فرہنگ ایرانی
پیش از معمول دانست (کنجینہ، ص ۲۳)

ایر عنصر المعانی یکاؤس بن اسکندر بن شمس المعالی قابوس بن وشمگیر بن زیار دمتونی (۴۶۶ھ) نے اپنے بیٹے کیلان شاد کی تربیت کی غرض سے ہندو نصاب پر مبنی یہ کتاب (قابوس نامہ) تالیف کی، اس میں تمام امور رسوم اور عادات و خصائل کے حدود و متعین و مقرر کئے گئے ہیں اور ہر عمدہ و منصب اور پیشہ کے تقاضوں اور آداب کو مرتب کیا گیا ہے، قابوس نامہ کی تاریخ تالیف میں اختلاف ہے، مولف کے مقدمہ کتاب میں درج ہے،

”و این را آغاز کردم بسنہ خمس و سبعین و اربعم پتہ“ (۴۶۵ھ)

اسی تاریخ یعنی ۴۶۵ھ کو جارج ایڈوارڈ براؤن، ڈاکٹر رضا زادہ شفق اور ملک اشعر احمد تعلق بہار نے نقل کر دیا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ تاریخ مازندران، حبیب السیر اور تاریخ طبرستان وغیرہ کتابوں میں مولف کی تاریخ وفات بالاتفاق ۴۶۶ھ بیان کی گئی ہے، اس بنا پر قابوس نامہ کا سال آغاز ۴۶۵ھ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے نسخہ قدیم پر کاتب نے غلطی سے بجائے ۴۶۵ھ کے ۴۶۴ھ درج کر دیا ہو، جو بغیر تحقیق بعد کے تمام نسخوں میں نقل ہوتا رہا،

مقدمہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکاؤس نے اس کتاب کا نام نصیحت نامہ رکھا تھا، ہو سکتا ہے مولف کے نام کی رعایت سے اس کے بجائے قابوس نامہ مشہور ہو گیا، ہولیہ چوالیس ابواب پر مشتمل ہے، اس کی زبان لوہو طریبان وہی ہے، جو چوتھی پانچویں صدی ہجری میں ایران کے فارسی ادیبوں کے یہاں رائج تھی، شروع سے آخر تک کہیں تصنع اور تکلف کی مثال نہیں ملتی، زبان و بیان

کی سادگی دروانی اور بے تکلفی پوری اثر آفرینی اور سحر کاری کے ساتھ ہر جگہ نمایاں ہے، اس میں عربی کے صرف دہی الفاظ اور عبارتیں استعمال ہوئی ہیں جو اس عہد کی فارسی ادبیات میں رائج تھیں، مولف کتاب فارسی اور طبری زبان میں شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ قابوس نامہ کے اڑتالیس اشعار میں سے آٹھ خود ایر عنصر المعالی یکاؤس کے ہیں، باقی میں سے گیارہ گنم طور پر نقل ہوئے ہیں اور عسجدی ترمذی گزٹھانی، فرخی کے ایک ایک اور ابو شکور بلخی کے دو شعرا کے ہیں، ایک عربی شعر بھی ہے قابوس نامہ کا، تنہا ان سے دوبارہ ۲۷۵ھ اور ۱۲۸۵ھ میں شائع ہو چکا ہے، ابھی چند سال پہلے مفصل مقدمہ کے ساتھ ایک ایرانی ایڈیشن طبع ہوا ہے،

ایر عنصر المعالی کی وفات کے تقریباً تیس سال بعد نظام الملک طوسی (۵۸۰ھ تا ۶۱۰ھ) نے ۵۸۵ھ میں تالیف کی، نظام الملک طوسی اپنی عمر کے آخری چونتیس سال وزارت اور وزارت عظمیٰ کے اہم عہدوں پر فائز رہا، اس نے اپنے تجربات زندگی سیاست نامہ کی پچاس فصلوں میں درج کر دیئے ہیں، ان پچاس ابواب میں سے تینتالیس ابواب کے عنوان سے وہی ہیں جو قابوس نامہ کے ہیں، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا سیاست نامہ کے متعلق اپنی کتاب تاریخ ادبیات در ایران میں تحریر کرتے ہیں:-

”..... و امر و ترکی از جملہ بہترین

آثار ادبی فارسی شمر وہ می شود، این

کتاب در سلاست انشا و جزالت

عبارت و روشنی مطالب و تنوع

موضوع در میان کتب فارسی کم زیر است

یہ فارسی کے بہترین ادبی آثار میں شمار

ہوتی ہے، بیان کی سلاست، عبارت کی

خوبی، موضوع کے تنوع اور مطالب کی

وضاحت کے اعتبار سے فارسی میں اس کا

نظر کیا ہے،

لئے تاریخ ادبیات در ایران ص ۵۰۵ و جلد دوم از ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا،

خاتمہ کتاب پر نظام الملک خود لکھتے ہیں۔

”دریں کتاب ہم پند است و ہم
مثل است و ہم تفسیر قرآن و ہم
بخار حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ
و سلم و قصص انبیاء علیہم السلام و ہم
سیرت و حکایات بادشاہان عادل
است از گذشتگان خیر است و از
ماندگان سمر است و باری ہم در ازی
مختصر است و شائستہ بادشاہ دادگراست“

اس کتاب میں امثال و نصائح، تفسیر و
وجدیث قصص انبیاء و حکایات بادشاہان
عادل سبھی چیزیں ہیں گزرے ہوئے
لوگوں کے واقعات ہیں اور جو رہ گئے
ہیں ان کے لئے داستان چاہے اس
طوالت کے باوجود مختصر ہے، اور نصف
بادشاہ کے لائق ہے،

سادگی، انشاء، سلاست زبان اور مؤلف کی بلاغت اور ہمارے تحریر کا یہ عالم ہے کہ صدیاں
گذر گئیں لیکن آج تک اس کتاب کی تازگی اور مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی، کتاب کی انشاء کے
متعلق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں۔

دریں نثر رواں و فصیح و طبع ہم بیچ
کلمہ کی مورد نیامہ و دور از لزوم
و جملہ ہائے کوتاہ و صریح آں بیچ کوز بہا
در معنی باقی نگذاشته است
اس روای اور فصیح ترین کوئی نقطہ محل
نہیں آیا ہے، چھوٹے چھوٹے صاف جملے
ہیں جن میں کسی قسم کا ابہام
نہیں ہے،

پھر سیاست نامہ کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے لئے تحریر کرتے ہیں۔

”... اطلاعات ذمی قیمت و ہا
اسی کے ذریعہ منلوں سے پہلے کے ایران

لے سیاست نامہ از نظام الملک طوسی لے تاریخ ادبیات در ایران جلد دوم،

تنگیلات سیاسی و مملکتی ایران جو
پیش از غلبہ مغولان و خاصہ در دورہ
سلجوقیان بزرگ بدست آورد و این
جنبہ خاص است کہ سیاست نامہ
داد شمار کتب معروف فرہنگ و تنگیلات
اجتماعی ایران در عہد قدیم قرار میدہے

خصوصاً سلجوقی دور کی سیاسی اور ملکی کیفیت
کے بارہ میں بہت اہم معلومات حاصل ہوتی
ہیں، اس بنا پر سیاست نامہ عہد قدیم
میں ایران کی اجتماعی زندگی کے بارے
میں اہم کتاب شمار ہوتی ہے۔

تالیف کیاب کے متعلق خواجہ نظام الملک نے مقدمہ کتاب میں خود صراحت کر دی ہے
کہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کے ایما پر امور مملکت و جہان داری کے مستحکم دستورہ آئینی نیرتیم
بادشاہوں کے رسوم و ریزہ اور اپنی وصیتوں پر ایک مہبوط کتاب تلمیذ کو کہہ کے اپنے پاس رکھ لی، جب
ملک شاہ ۸۵ھ میں بغداد گیا تو کتاب سے اجزا بادشاہ کے کاتب خاص محمد مغربی کے حوالے
کے گئے، تاکہ یہ اور اق بیاض کی شکل میں ہو جائیں، نظام الملک نے پہلے سیاست نامہ
انتہا لیس ابواب میں مرتب کیا تھا، لیکن بادشاہ کی پسندیدگی کے بعد اختصار کی جگہ تفصیل سے
کام آیا، ہر باب کے ضمن میں بہت سے نکات کا اضافہ کیا، اور گیارہ ابواب بڑھا دیئے، اس کے
بعد مذکورہ بالا شاہی کاتب نے اس کی کماست و آرائش کا کام شروع کیا، جو محمد بن ملک شاہ کے
عہد (۴۹۲ھ، ۵۱۱ھ) میں انجام کو پہنچا، لیکن اس اثنا میں ملک شاہ کی بھی وفات ہو گئی، اور
نظام الملک بھی باطنیوں کے اشارہ پر جام شہادت نوش کیا،

سیاست نامہ کے علاوہ نظام الملک کا ایک مکتوب بھی دستیاب ہوا ہے، جو انھوں نے اپنے
بیٹے نظام الدین ابوالفتح خزاہی کو اس وقت تحریر کیا تھا، جب وہ الپ ارسلان کے عہد میں

لے تاریخ ادبیات در ایران جلد دوم،

ملک شاہ کے ساتھ فارس جانے کے بعد مامور ہوا تھا اور اربت کے شرائط و ضوابط اور سفارشات پر مشتمل یہ مکتوب دھیایاے نظام الملک یا دستورالوزیر کے نام موجود ہے، ایک اور رسالہ بنام قانون الملک بھی نظام الملک کے نام سے منسوب ہے، لیکن وہ سیاست نامہ کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے،

جہ الاسلام امام غزالی (متولد ۵۰۵ھ بمطابق ۱۱۱۱ء) نے سلطان بخر میں ملک شاہ بلوچی کے لئے ۵۰۳ھ بمطابق ۱۱۰۹ء میں ایک کتاب نصیحتہ الملوک کے نام سے تالیف کی، اس کا موضوع اخلاق و سیاست ہے، مولف نے دعویٰ کیا کہ کتاب کی بنیاد دین پر قائم کی گئی ہے، لیکن فلاسفہ و روش کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولف اپنے دعویٰ میں پورے نہ آئے، اس کتاب کی تالیف سے بادشاہ اور درباریوں کی ہدایت و رہنمائی مقصود تھی، آغاز کتاب میں اعتقاد و ایمان کے اصول و مسائل کا ذکر ہے، پھر اس کے بعد بادشاہوں و وزیروں، بیوروں اور دانش مندوں کی سیرت و حکمت بیان ہوئی ہے، اس کتاب کا ترجمہ عربی میں البتراء الملوک فی نصیحتہ الملوک کے نام سے ہوا ہے، ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے،

جہ الاسلام امام غزالی کی ذات قحاج تبارت نہیں، انھوں نے اسلامی عقائد و اعمال اخلاقی و ادب اور تہذیب و معاشرت پر ایک اہم کتاب ایجاد العلوم تصنیف کی ہے، پھر فارسی داتوں کے لئے اس کے مطالب کا خلاصہ کیسیانے سعادت کے نام سے خود ہی کیا ہے،

ہندی اصل و اتان کیلہ و دمنہ منکر سے پہلوی زبان میں منتقل ہوئی اور پھر عبداللہ بن مقفع نے پہلی بار سے عربی میں اس کا ترجمہ کیا، سانی میں سے فارسی نثر اور شکر کا جامہ عطا ہو چکا تھا، لیکن اب وہ ناپید ہے اس وقت صورت و رنگ کی مشوم کیلہ و دمنہ کے چند آیات باقی ہیں ابوالمعالی نصر اللہ بن عبداللہ بن مقفع کے عربی ترجمے سے ۵۳۹ھ میں کیلہ و دمنہ فارسی میں منتقل کی اور اسے بہرام شلوغ زوی (۵۱۲ - ۵۴۶ھ) کے نام سے منون کیا

ابوالمعالی نصر اللہ نے اس میں فارسی و عربی و امثال و اشار کا اضافہ بھی کیا ہے، اپنی عمدہ نثر کی وجہ سے یہ کتاب فارسی کی ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، کیلہ و دمنہ کے ماخذ و ترجم پر ماقم کا ایک تفصیلی مقالہ معارف کے وسبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے،

کیلہ و دمنہ کے علاوہ مرزبان نامہ، جو اس کی حکایات اور سند با و نامہ وغیرہ کتابیں بھی اخلاق و موعظت کے زمرے میں آتی ہیں، انگلستان سعیدی اور اس کی تقلید میں جتنی کتابیں موعظ و ہجو میں آئیں ان کا موضوع بحث بھی اخلاق ہی ہے، سعیدی شیرازی (متولد ۹۹۱ھ بمطابق ۱۲۹۱ء) نے انگلستان میں آداب و اخلاق اور سیاست و حکومت کے ان تمام موضوعات اور افکار و نظریات کو یکجا کر دیا ہے، جو اس عہد تک اسلامی معاشرے میں مروج تھے، اگر کہیں عہد قدیم کی ہدایت کے اقتباسات درج کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، تو اسے اسلام کی کسوٹی پر ضرور پرکھ لیا گیا ہے، گرچہ سعیدی کے عہد میں فارسی نثر میں تصنیف و تکلف، موازنہ اور سمجھ عام ہونے لگے تھے، لیکن سعیدی نے سادگی اور روانی کو اختیار کیا اور ایسی دلچسپ و مرغوب اور گراں قدر تالیف ایجاد کی، پھر عربی جو اپنی مثال آپ ہے، انگلستان سعیدی کی تقلید میں جتنی کتابیں تالیف و تصنیف ہوئیں ان کی حیثیت صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں ہے،

اولیٰ قرن ہفتم کی ایک کتاب تحفۃ الملوک کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر ذبیح اللہ کی رائے ہے کہ اس کا شمار فارسی کی اول درجہ کی کتابوں میں ہوتا ہے، مولف کا نام معلوم نہیں نہ سنہ تالیف کا پتہ ہے قیاس ہے کہ ۱۱۵ھ کے قریب تالیف ہوئی، اس کتاب میں اردو کی کئی کئی کیلہ و دمنہ اور شاہنامہ فردوسی کے احکام و امثال سے استفادہ کیا گیا ہے، اس ضمن میں ادا ترقن ششم ہجری کے ایک شاعر و مولف استاذ اللامہ رضی اللہ عنہما پورما کی کتاب مکارم الاخلاق کا ذکر بھی ہے، جانہ ہوگا، جس کا ایک قلمی نسخہ مدرسہ عالیہ سپہ سالار (ایران)

میں موجود ہے، یہ چالیس ابواب پر منقسم ہے،

حکمت عملی یا اخلاق پر تین کتابیں اخلاق ناصری، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی نے بڑی شہرت و قبول عام حاصل کیا، ساتویں صدی ہجری میں نصیر الدین محمد بن محمد طوسی (متولد ۹۰ھ مطابق ۱۲۰۱ء متوفی ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء) برٹش میڈیکل کالج میں سال ولادت ۵۰ھ اور سال وفات ۶۹۲ھ درج ہے، لیکن اول الذکر تاریخ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفاء ملک شاعر، آفٹے محمد تقی بہار اور ڈی ایم ڈونالڈ سن وغیرہ اسی تاریخ پر متفق ہیں، نون اخلاق پر دو کتابیں تالیف کیں، ایک کا نام اخلاق محسنی اور دوسری کا اخلاق ناصری ہے اخلاق ناصری حاکم قستان ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور مجتہد (متوفی ۹۵۵ھ مطابق ۱۱۵۷ء) کی فرمائش پر ۴۳۳ھ میں ترتیب دی گئی اور حاکم مذکور کے نام سے معنون کی گئی، اس کے مقدمہ میں نصیر الدین طوسی نے اقرار کیا ہے کہ یہ کتاب ابن مسکویہ (متوفی ۴۲۱ھ) کی عربی کتاب تہذیب الاخلاق فی تہذیب الاخلاق کا ترجمہ اور خلاصہ ہے، اس میں طوسی نے اپنی طرف سے امور منزل اور ریاست مدین میں بعض مطالب کا اضافہ کیا ہے، تذکروں میں آیا ہے کہ امور منزل میں ابن سینا (متولد ۳۷۰ھ متوفی ۴۲۸ھ) سے اور ریاست مدین میں ابو نصر فلانی (متوفی ۳۳۹ھ) سے استفادہ کیا ہے، خواجہ نصیر الدین طوسی نے اخلاق ناصری کے مقدمہ میں یہ واضح کر دیا ہے، کہ حکمائے قدیم کے خیالات کا انھوں نے یا تو ترجمہ کیا ہے، یا ان کی وضاحت و تشریح کی ہے، اس میں مذہب سے اختلاف و اتفاق کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے،

خواجہ طوسی نے اخلاق آمدیر منزل اور ریاست مدین کے مباحث تین مقالوں اور تین

طے برٹش میڈیکل کالج ص ۲۴۱

نوٹ۔۔ اس کتاب کا صحیح نام تہذیب الاخلاق و تہذیب الاخلاق بھی مشہور ہے، عالم

فصلوں میں بیان کے ہیں، آخری فصل میں حکیم افلاطون کی وصیتیں قلم بند کی ہیں جو تمام ابواب میں زیادہ مفید ہیں، اخلاق ناصری کی طرز تحریر کے متعلق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفاء کی رائے ہے

”یہ درسی کتاب ہے، اس کی انشاء محکم اور حکماء کے طرز پر خشک و نامعانی کی طرف توجہ زیادہ ہے“

خواجہ نصیر الدین طوسی نے اس فن میں دوسری کتاب اخلاق محسنی کے نام سے تالیف کی ہے

بھی حاکم قستان مذکور کے نام پر معنون کیا ہے، ان دونوں کتابوں کی طرز جد ہے، اس نے کہ اخلاق محسنی مکارم اخلاق پر مشتمل ہے، اور آیات قرآنی اور احادیث پر مبنی خدا اور رسول کے احکام، علما کے نکات و اشارات، عملی اماموں اور داعیوں کی دینی دعوت و افکار اور حکماء و بزرگان کے اقوال پر مشتمل ہے، لیکن اخلاق ناصری کی بنیاد محض علم اخلاق پر ہے جس میں فلاسفہ اور اہل دانش کے خیالات پیش کئے گئے ہیں، مذہب و عقیدہ سے اختلاف و اتفاق کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، ان دونوں کتابوں

کے علاوہ خواجہ نصیر الدین نے اخلاق و تربیت پر مجد الدین بن المقفع (متوفی ۱۲۵ھ مطابق ۷۱۷ء)

کے رسالہ ”الادب الوجیز للولد الصغیر“ کا ترجمہ بھی کیا ہے، اور ایک رسالہ فضائل امیر المومنین پر بھی

پہر قلم کیا ہے، اسے بھی اخلاق و تربیت پر خواجہ طوسی کے آثار میں شمار کرنا چاہئے، ہندوستان

میں پہلے شاہ عالمگیر کے عہد میں عبدالرحمن بن عبدالکریم عباسی برہنپوری نے توضیحات و شرح لذت کیساتھ اخلاق ناصری

کا تین ۶۳۳ میں شائع کیا اور اسکے بعد بارہا اسکی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا اخلاق ناصری کی ایک شرح کا خلاصہ تہذیب الاخلاق

کے نام سے بڑولین میں موجود ہے اسکی ایک شرح بول احمد دموفت لغت معرون بہ ہفت اقلیم نے بھی لکھی تھی،

دوسری کا خلاصہ اخلاقی کتاب اخلاق جلالی کے نام سے مشہور ہے، اس کتاب کا نام لراس

الاشراق فی مکارم الاخلاق ہے، اس کے مصنف مولانا جلال الدین محمد بن سعد الدین اسود الصیقلی

الدوانی اکادرونی (متولد ۸۳۰ھ مطابق ۱۴۲۷ء متوفی ۹۰۸ھ مطابق ۱۵۰۲ء) ہیں، یہ صوبہ خوارزم

سہ گنجینہ سخن ص ۱۳۹، ذبیح اللہ صفاء

میں کا زردن کے قریب دوان کے رہنے والے تھے، تذکرہ حیب السیر میں دوانی کا ذکر ان الفاظ میں ہے:-

..... فنون مکتون کہ اذ ابو علی
 سینا (شیخ الرئیس) و علامہ طوسی نصیر الدین
 در ہر خطا مجتہب بود در نظر بصیرت شمس
 جلوہ ظهور داشت داسر ار خیزوں کہ
 از معلم اول ارسطو و از معلم ثانی فارابی
 مکتوم ماندہ بود قلم عنایت سبحانی بر صحنہ
 ضمیرش نکاشت

یوعلی سینا اور علامہ طوسی کے وہ فنون
 جو پردہ خفا میں تھے ان کی نظر بصیرت
 کے سامنے جلوہ پذیر ہوئے اور معلم اول
 ارسطو اور معلم ثانی کہ جو اسرار دہے ہوئے
 تھے، عنایت سبحانی کے قلم نے ان کے ضمیر
 ضمیر پر درج کر دیئے،

اخلاق جلالی کو دوانی نے سلسلہ آق قویونلو کے مؤسس امیر حسن بہادر خاں ترکمان معروف بہ اوزون حسن یا حسن بیگ بائیندری (متوفی ۸۸۲ھ) کے عہد حکومت میں دلی عہد سلطان خلیل عالم فارس کی ابتداء پر ۱۴۶۶ء، ۱۴۶۷ء، ۱۴۶۸ء کے درمیان تالیف کیا، اور اسے امیر حسن بہادر خاں معروف بہ اوزون حسن کے نام پر منون کیا، لیکن ذبیح اقصاف لکھے ہیں کہ بنام سلطان خلیل فرزند اوزون حسن مؤسس آق قویونلو نوشتہ شدہ است۔ دوانی نے اخلاق جلالی کی تالیف میں اخلاق ناصری سے استفادہ کا اقرار کیا ہے، چنانچہ تتمہ کتاب میں اس کی تصریح کی ہے،

اخلاق جلالی ایک مقدمہ امدتین لوامع پر مشتمل ہے، لامع اول میں تہذیب اخلاق، لامع دوم میں تدبیر منزل اور لامع سوم میں سیاست مدنی پر بحث کی گئی ہے، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ تھامپسن نے پریکٹیکل فیلاسوفی آف محمد بن مسلم کے نام سے کیا ہے،

تذکرہ حیب السیر از خاندان میرزا کچھنہ سخن از ذبیح اللہ لکھ اخلاق جلالی از دوانی،

اگرچہ یہ کتاب اخلاق ناصری سے محفوظ ہے، لیکن دوانی خود فلسفی تھے اور مختلف فنون پر ان کی دستخط تالیفات پائی جاتی ہیں، تفسیر میں سات، فلسفہ و کلام میں تین، فقہ و اصول و حدیث میں آٹھ، منطق میں آٹھ اور ادبیات میں سات، علوم متفرقہ میں چھ اور ہیئت و ہندسہ میں چار کتابیں دوانی سے منسوب ہیں، وہ تمام علوم دروجہ کے ماہر تھے اس لئے ان کی تالیفات میں بہت سی خوبیاں جمع ہیں، اخذ نتائج میں یہ نصیر الدین طوسی سے زیادہ کامیاب ہیں، لیکن ان کے یہاں طوسی جیسا زور کلام اور جوش بیان نہیں ہے، معانی کے لحاظ سے اخلاق جلالی کا مقام بلند ہے، لیکن زبان کے معاملہ میں کچھ وہ گئی ہے،

کتاب کی تمہید میں دوانی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اخلاق کے فلسفہ کو محقق طوسی سے زیادہ اس زبان میں پیش کریں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی زبان طوسی سے زیادہ ثقیل ہو گئی ہے، اس گراں باری کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ اس میں عربی کلمات اور فقرے کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دوانی جس اخلاقی اصول کو پیش کرتے ہیں اس کی تشریح میں تفصیل کے بجائے مختصر سے کام لیتے ہیں مقفی نگاری نامازی احمد کے قبل ہی مروج ہو چکی تھی، دوانی نے بھی شہور طرز پر مقفی نگاری کو اختیار کیا ہے، مقفی نگاری کے علاوہ دوانی نے جای حکم سائی و حافظ کے اشعار بھی نقل کئے ہیں، احادیث نبوی سے دلائل بھی پیش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اخلاق جلالی کی زبان میں سنجیدگی و منانت تو آگئی، لیکن اخلاق ناصری اور ابوالدوانی نے پیدا ہوئی، دوانی نے مطالب کے علاوہ ابواب کی ترتیب اور لمحات کی تقسیم میں بھی محقق طوسی کی پیروی کی ہے، طوسی کے خیالات محض ابن مسکویہ کے خیالات کا ترجمہ نہیں ہیں، بلکہ اس میں خود اس کی فہم و دانش اور تفکر و تدبر کو بھی بڑا دخل ہے، دوانی نے طوسی کی پیروی تو کی لیکن ان کے یہاں ذاتی غور و فکر کے اس اعلیٰ معیار کا فقدان نظر آتا ہے جو طوسی کے یہاں موجود ہے، جلالی نے طوسی کے بہت سے فلسفیانہ نکات

کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا ہے، اور خود بہت نکات کا اضافہ بھی کیا ہے، لیکن ادبی اعتبار سے اس کا انداز تحریر زیادہ قابلِ تحسین نہیں ہے، لیکن دی۔ ایم ڈوناٹسن کی رائے اس کے برعکس ہے، وہ لکھتے ہیں:-

”ہند اور ایران میں بکثرت اس کا مطالعہ کیا جانا صرف اخلاقی تعلیمات کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اس میں کتاب کی ادبی اہمیت کو بھی دخل ہے، لیکن ڈوناٹسن کی دریافت شاید درست نہیں معلوم ہوتی، اس لئے کہ دوانی نے خود بھی اقرار کیا کہ ایسی تصنیفیں پہلے بھی ہو چکی ہیں، لیکن ان میں ایسی غیر متعارف عبارت اور غریب اشعار ہیں، جو اب رائج نہیں ہیں، اس لئے وہ انہیں آسان اور قابلِ فہم بنا چاہتے ہیں، لیکن اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ ناصری کا تعابلی مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان اور زیادہ گراں بار ہو گیا ہے،

آقائے محمد تقی بہار، ملک الشعراء اپنی کتاب سبک شناسی میں دوانی کے متعلق لکھتے ہیں:-
”وہ محکم، فاضل محقق اور منطقی و ادیب تھے، علمی مسائل میں دوانی کا طریقہ و سبب ازمانہ قدیم کا تھا“

اتنی بات ضرور ہے کہ ان کی نثر ایک خاص انداز کی ہے، اور ان کا اپنا ایک مقصد طرزِ نثر تذکرہ صیب السیر میں ہے کہ ان کا طرزِ نثر پندیر اور انداز بیان ایسا خاص ہے کہ اگر کوئی ان کی صرف ایک کتاب دیکھ لے تو ان کی بے نام کتابوں کو دیکھ کر شناخت کر لے گا،
علی دوانی شرح زندگانی دوانی میں لکھتے ہیں:-

وہ دوسروں کی باتوں پر کم قناعت کرتے ہیں، اسلئے وہ انداطون کے خیالات بھی اپنے طرزِ بیان کرتے ہیں اور ابن سینا وغیرہ کی تحقیقات زیادہ محکم و متین انداز میں پیش کرتے ہیں، علم کے

لئے اسٹریزان اسلامیات میں از ڈوناٹسن ص ۳۱۱ تا ۳۱۲ از محمد تقی بہار

روشن ستاروں کے درمیان زہرہ کی طرح درخشاں و تاباں ہیں، وہ ہر فن میں استاد تھے، اور ہر علم میں دستاورد رکھتے تھے، دقائقِ فلسفہ، رموزِ قرآنی، نکاتِ عرفانی اور مطالعتِ ادبی جلال الدین کے ہاتھ میں موم ہو جاتے تھے

ملاو اعظٰی حسین کاشفی سبزواری (متوفی ۱۰۷۱ھ) نے اصولِ اخلاق پر ایک کتاب اخلاقِ محسنی تالیف کر کے ابو الحسن بن ابوالغازی سلطان حسین ابن بایقرا کے نام پرمعنون کیا، ڈاکٹر رضا زوہد شفق نے سنہ تالیف ۸۹۰ھ قرار دیا ہے، لیکن کتاب کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ ہے، جس کی رو سے اخلاقِ محسنی کا ۹۰۰ھ مطابق ۵۰۲-۱۲۹۲ء میں تالیف ہونا ثابت ہوتا ہے، براؤن کو بھی مورخانہ کو تاریخ سے اتفاق ہے

اخلاقِ محسنی چالیس ابواب پر مشتمل ہے، زبان کیسے بہت سادہ اور واضح اور کہیں سیدھے محقق کہیں کہیں گلستانِ سعدی کی بھی تقلید کی گئی ہے، نثر مصنوعی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اس میں عوامِ اناس کے اخلاق و عادات زیر بحث نہیں آئے ہیں، بلکہ بادشاہ کے لئے کچھ اصولِ سیاست کی وضاحت کی گئی ہے، مقدمہ کتاب میں خود لکھتے ہیں:-

بادشاہ را رعایت چہل صفت لازم	بادشاہ کے لئے چالیس صفت ضروری
است کہ بعضی از ارا میںان دی و	ہیں ان میں سے بعض اس کے اور خدا کے
حق سبحانہ تعالیٰ باشد و برنے میان	در میان ہیں اور بعض اس کے اور مخلوق
دی و خلق و این پہل صفت در چہل	کے درمیان ہیں اور چالیس صفتیں چالیس
باب آگوردہ شد	ابواب میں درج کی گئی ہیں

شرح زندگانی دوانی از علی دوانی

جامعہ براؤن جلد سوم ص ۲۲۲

تاریخ ادبیات ایران از رضا زوہد شفق لٹریچر میگزین پرنٹنگ

محمد تقی بہار کاشفی کی طرز و روش کے متعلق لکھے ہیں۔

کاشفی کی نثر رنگ برنگ کی ہے، کبھی بہت سادہ و مختصر لکھتے اور کبھی شیخ سعدی کی گلستاں کی تقلید کرتا ہے۔

داعظا حسین کاشفی نے اسی ممدوح کے حکم سے کتاب کھیلہ و دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی کے نام سے کیا، انوار سہیلی بھی اخلاق و تربیت اور حکمت و دانش کے مباحث پر گراں قدر تالیف ہے، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی کا سلطان سلیم دوم کے عہد حکومت میں ترکی زبان میں ترجمہ ہوا، پیر محمد بن پیر احمد بن غلیل کے یہ ترجمے انیس اعمار فیین کے عنوان سے شائع ہوئے، اخلاق محسنی سے متاثر ہو کر حسن بن روز بجان شیرازی نے اخلاق شمسیہ کے نام سے نظم آمیز نثر تالیف کر کے شمس الدین محمد کے نام معنون کی، اخلاق ناصری، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی تینوں کے ترجمے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ہو چکے ہیں،

اخلاق ناصری، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی کے متعلق براؤن لکھے ہیں،

ایران کے اہل دانش طبقہ کا رجحان اخلاقیات سے زیادہ مادہ و طبیعیات اور تصوف کی طرف ہے اور ان تینوں کتابوں کی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی ہے کہ یہ ضمنی طور پر ایرانی رسم و رواج، اداروں اور طرز تفکر پر روشنی ڈالتی ہیں، اخلاق جلالی کا اسلوب ان تینوں میں حد سے زیادہ متنوع ہے،

شہرت مقبولیت کے اعتبار سے مشہور صوفی پیر علی بن شہاب الدین ہمدانی کی ذخائر الملوک بھی سابق الذکر تصانیف کی ہم پلہ ہے اس میں تدبیر منزل اور امور جہاں داری سے بحث کی گئی ہے، ان کی وفات ۱۰۸۶ء میں کشمیر میں ہوئی، اس کتاب کی پہلی دو فصلیں عقائد و عبادات

۱۳ بک شمس جلد سوم از محمد تقی بہار

سے بحث کرتی ہیں، اس کے بعد خاندان کے مختلف افراد کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، پانچویں اور چھٹی فصل میں حکومت کے قوانین اور ریاست کے اغراض و مقاصد اور اصول پر بحث ہے، ایک دوسری کتاب اخلاق سلطانی ہے جسے فتح اللہ بن احمد بن محمد نے ملک فخر الدین محمد جوہا (سلطان محمد تغلق شاہ ۱۲۵۰ء - ۱۲۵۲ء) کے لئے تالیف کیا اور امیر ظہیر الدین ابراہیم شاہ کی خدمت میں پہنچا کر دیا، حسن علی المنشی اسحاق فانی بن اشرف نے ۹۸۸ھ میں کابل میں اخلاق حکیمی تالیف کر کے میرزا محمد حکیم پیر شاہ ہمایوں کے نام معنون کی، ابو عنفہ جہانگیر کے نام سے ایک کتاب میرزا محمد بابا یا باقر خاں ملقب بہ نجم ثانی نے شاہ جہانگیر کو متنبہ کرنے کے لئے تالیف کی، جہانگیر ہی کی توجہ کیلئے نور الدین محمد قاضی خاقانی پسر شیخ حسین الدین نے اخلاق جہانگیری تالیف کی، ان کے علاوہ اس موضوع پر اختیار حسین (۹۱۳ھ مطابق ۱۵۰۶ء) نے شاہزادوں اور امیروں کی اخلاقی تربیت کے لئے اخلاق ہمایوں تالیف کر کے شاہ بابر کے نام معنون کیا، یہ کتاب عربی تالیفات بخصوص تہذیب الاخلاق پر مبنی ہے، فضل بن روز بجان اصفہانی نے دسویں صدی ہجری میں سلوک الملوک تالیف کی، یہ کتاب عبید اللہ خاں ازبک کے نام معنون ہوئی، جلال الدین طباطبائی نے پندرہواں صدی یا توقعات مطول تالیف کر کے ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں شاہجاں کے بیٹے شاہزادہ مراد کے نام معنون کیا، علی بن طیفور بسطامی نے تحفہ قطب شاہی سلطان عبدالعزیز شاہ حیدرآباد (۱۰۲۵-۱۰۸۳ھ) کے نام پر تالیف کی، ملا احمد نوری (متوفی ۱۸۲۸ء) نے انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں معراج السعادت لکھی، جس میں ان اخلاقی تعلیمات کی اہمیت و افادیت ثابت کی گئی ہے، جو فلسفہ یونان و اسلام کے تقریباً ہزار سالہ ارتباط کی بنا پر معمولات زندگی میں داخل ہو گئی تھیں، شیخ جاس القسی نے ملا احمد نوری کے عام اخلاقی اصولوں کی تلخیص ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کی جو تلخیص مقامات کے نام سے مشہور ہے، ایران جدید میں جب خاندان پہلوی کے

اجیار کی ہم اپنے شباب پر تھی اُمنی دونوں ۱۹۳۷ء میں ایک کتاب اخلاقِ روحی کے نام سے شائع ہوئی، اس کا مولف ایرانی مجلسِ دپارٹمنٹ کا ایک ممبر تھا، مدارس میں اخلاقی تعلیم کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ہے، اس میں قرآن و حدیث کے بکثرت اقتباسات کے علاوہ ایرانِ قدیم و جدید کے شعرا کے بر محل اشعار بھی درج کئے گئے ہیں،

فارسی نثر میں چند اخلاقی کتابیں ایسی تالیفات ہوئیں جن کا شمار اخلاقیات کے ساتھ دنیا کے زمرے میں بھی ہو سکتا ہے، یہ ہیں، ہدیہ شامی، اخلاقِ شفا فی اور ابوابِ سبحان، اولیٰ لذر کو عبد الغفار بن نور اللہ شہرچی نے تالیف کر کے سلطانِ رستم بہادر خاں کے نام معنون کیا، اس میں ۱۲ فصلوں میں ۱۲ فضائل اور ۱۲ بارہ ردائل کا ذکر ہے، اخلاقِ شفا فی کا مولف مظفر حسین اللطیب الکنانی متخلص بہ کاشانی (متوفی ۹۶۳ھ) ہے، اس کے پہلے حصہ میں ۲۱ فضائل اور ۱۷ ردائل کا ذکر ہے، محمد رفیع واعظ قزوینی (متوفی ۱۱۰۵ھ) نے ابوابِ سبحان تالیف کی،

یجانہ ہوگا اگر اس ضمن میں اقوالِ زریں اور ضرب الامثال کی کتاب کا بھی اجمالی تذکرہ دیا جائے، اس موضوع پر جامع تریق تالیف جامع التمثیل ہے، جسے محمد علی جیلہ رومی نے ۱۰۵۴ھ میں حیدرآباد میں عبداللہ قطب شاہ کے وزیر شیخ محمد انخاتون کی فرمائش پر مرتب کیا تھا، بعد کو اس کتاب میں اضافے کئے گئے اور اب اصل کتاب سے کچھ گنی زیادہ ضخیم ہو گئی ہے، اسے دانش گاہِ تہران کے استاد (پروفیسر) ڈاکٹر صادق کیانے ایڈٹ کر کے ایران سے شائع کیا ہے،

اقبالِ کامل

اس میں ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کی شاعری، اہم موضوعوں مثلاً صفتِ لطیف (عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

”میجر“

قیمت: ۵۰-۱۳۰

سلطنتِ مغلیہ کے آخری عہد کا ایک شاعر

نواب حکیم الممالک شیخ حسین شہرت

از ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری صاحب شعبہ فارسی لی ای این بی کالج کراچی

اوزگ زیب کے آخری زمانے تک مغلیہ سلطنت کی وسعت و استحکام میں برابر اضافہ ہوتا رہا، لیکن جس وقت اس دورِ پیش صفت فرمانروا نے وفات پائی تو اس معلوم ہوتا تھا کہ سلاطین مغلیہ کا اقبالِ سلطنت در اقبالِ نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، چنانچہ چند سال کے بعد ہی اس میں ہبوطِ ذوالِ شمس کے آثار نظر آنے لگے، اور گریب کے بعد اس کے جانشینوں میں اتنی صلاحیت نہیں رہی کہ وہ ہندوستان کی طویل و عریض سلطنت ٹھیک سے سنبھال سکے، ان کے اوقات زیادہ تر خانہ جنگیوں میں صرف ہوتے رہے، فارسی شاعری اور علم و ادب کی طرف اچھی طرح دھیان دینے کی ان کو فرصت ہی کہاں تھی، اس بنا پر ان کے دور میں فارسی شاعری کی ترقی میں کمی آئی گئی، تاہم یہ کہنا ٹھیک نہ

ہوگا کہ ان کے عہد میں فارسی شعرا کا دستہ نہیں رہا، سیاسی بحران کے باوجود فارسی شاعری نے اس دور میں بھی اپنی خصیصیت قائم رکھی، اور سست رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی رہی، ان بادشاہوں کے زمانے میں بھی فارسی کے مشہور و معروف شعرا بساطِ شاعری پر نمودار ہوئے، اس کو زریب زینت

ملک پبلشرز، ہندوستان، مولانا عبد السلام ندوی، لکھنؤ، ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء)

بچے رہے ان شاعروں میں مرزا میرزا علی بیگ، حاجی محمد اسلم سالم، میر محمد زمان و آخ، سید صلابت خاں سید مرزا عبد الغنی بیگ قبول، لالہ حکیم چند ندرت، اور محمد افضل سرخوش وغیرہ کے نام سترہ حروفوں میں لکھے کے لائق ہیں،

مذکورہ بالا شاعروں کے محصر بلکہ ان میں سے بعض کے ہم پیالہ اور ہم نواز شاعر حکیم الممالک شیخ حسین شہرت تھے، جن کو شاہی حکیم اور درباری شاعر ہونے کا فخر حاصل تھا، تذکرہوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے بھی امیر خسرو کی طرح ہندوستان میں چھ سات بادشاہوں کے زمانے دیکھے بندر بن داس خوشگوار نے لکھا ہے کہ شہرت ایک کہنہ مشوق شاعر تھے، ہندوستان کے اکثر شاعروں کے ساتھ ان کی صحبت رہتی تھی، مرزا بیدل اور حاجی اسلم سالم ان کے ہمراہ شاہزادہ محمد اعظم شاہ کے دربار میں ایک ہی ساتھ اٹھے بیٹھے تھے، سید صلابت خاں سید جو امرائے دربار میں سے تھے، شہرت کے گھر کبھی کبھی بطور ہمان جایا کرتے تھے، مرزا عبد الغنی بیگ قبول، حکیم چند ندرت اور خود صاحب سیفینہ بھی شہرت کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں تھے سیفینہ کی جگہ میں ملاحظہ ہوں،

شاعر کہنہ مضبوط بودہ با اکثر شعراے ہندوستان صحبت داشتہ و با مرزا بیدل و حاجی اسلم سالم در سرکای اعظم شاہ کجا گذارده..... روزی سید صلابت خاں میر تقی بخاوند سے ہمان شد آن روز مرزا عبد الغنی بیگ قبول کہ یار غار رفیق شفیق ابو بود ہمراہ نبود باخان

۱۔ سیفینہ خوشگوار قلمی ص ۱۲۸ (الف)

مذکورہ گفت کہ معنی پر داز نواب کجا است کہ تشریف یا در وہ حکیم چند ندرت فقیر خوشگوار اکثر اتفاق در خدمت شہرت حاضر می شدیم بسیار تفضل و مہربانی می فرمود

اس پر سید صلابت خاں نے دریافت کیا کہ نواب صاحب کیوں نہیں تشریف لائے؟ حکیم چند ندرت اور رقم سطور خوشگوار کو اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا

نام اور جب دنب | شہرت کا ذکر فارسی کے ذیل بارہ تذکرہوں میں ملتا ہے، ممکن ہے کہ کچھ اور تذکرہوں میں بھی ان کا حال درج ہو، یہ سب تذکرے اس بات پر متفق ہیں کہ شہرت کا اصلی نام شیخ حسین تھا، حکیم الممالک لقب اور تخلص شہرت تھا، خدابخش خاں کتب خانہ (بابائی پور، اٹینہ) کے کیڈناگ میں ہے کہ ایک نام حکیم شیخ حسین اور تخلص شہرت تھا، یہ شاعر تھے، لیکن ان کے آبا و اجداد بحرین سے آکر شیراز میں بس گئے تھے، کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی (مبکال) کے کیڈناگ میں ان کا نام حسین شیرازی لکھا ہے، اور کتب خانہ بودلین (اکسفورڈ) کے کیڈناگ نے شاعر مذکور کا نام شیخ حسین اور تخلص شہرت لکھا ہے، اسپر جی کے کیڈناگ جلد اول ص ۱۲۲ میں ان کے طویل القاب "نواب حکیم الممالک فرخ شاہی درج ہیں، صاحب سیفینہ رقمطراز ہیں۔

حکیم الممالک شیخ حسین تخلص شہرت ہے وہ ملا خوشگوار تھے مگر ان کے ابو و اجداد نے شیراز کو اپنا وطن بنایا

صحف ابراہیم کے مولف نے بھی شہرت کے حسب نسب کے متعلق "صلش عرب بود" لکھا ہے صاحب

Cat of Arabic & Persian M.S.S. O.P.L Vol III No. 391 P 2061
Cat. Persian M.S.S. Asiatic Society Bangal No 449 N.B. 821
Cat of The Persian Turki Hindustan Pashtun & Odlian Lib -
۱۔ سیفینہ خوشگوار قلمی ص ۱۲۸ (الف) ۲۔ صحف ابراہیم قلمی ص ۱۲۲

مجمع النفائس نے لکھا ہے کمال دارم کہ از اعراب بحرین است، اور سرو آزاد کے مولف کے بیان کے مطابق بھی، اصلش عرب بود و ایران نشو و نما یافتہ، لیکن افنوس کی بات یہ ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے ان کے آبا و اجداد کے نام نہیں لکھے، نام کے ساتھ حکیم کا لفظ بھی تذکروں میں درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہرت نہایت مشہور و معروف طیب تھے، اور شاعری کے مقابلہ میں اسی فن اور پیشہ کی بدولت انھوں نے شاہی دربار میں رسائی حاصل کی تھی، اس ضمن میں سرو آزاد کی یہ عبارت خاص طور سے قابل ذکر ہے،

”وہ سرکار محمد اعظم شاہ بن غلام علی
بعنوان طبابت نوکر شدیہ
طیب کی حیثیت سے ملازم تھے،
محمد اعظم شاہ کے دربار میں شاعری

شہرت کو حکیم الممالک کا لقب کس بادشاہ نے عطا کیا؟ اس میں کسی قدر اختلاف ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ شاعر موصوف کو یہ لقب بادشاہ فرخ سیر نے دیا، چنانچہ مولوی خدابخش رحیم خوشگو، میر غلام علی آزاد، حسین علی خاں عظیم آبادی وغیرہ کے خیال کے مطابق شہرت کو یہ لقب بادشاہ فرخ سیر کے دربار سے ملا لیکن کتب خانہ بودلین ڈاکسفورڈ کے مولف، سفینہ ہندی کے مولف، صاحب مجمع النفائس اور صاحب مخزن الغرائب وغیرہ نے تحریر کیا ہے، کہ شاعر مذکور کو حکیم الممالک کا لقب محمد شاہ بادشاہ نے عطا کیا،

یہ بات تقریباً مسلم ہے کہ شہرت طبابت کے فن میں ماہر روزگار تھے اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اسی فن کی وجہ سے انھوں نے محمد اعظم شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کیا تھا، اس کے دربار میں وہ شاہی حکیم کی حیثیت سے ملازمت کرتے رہے، اور بعد میں جب ان کی شہرت زیادہ ہوئی تو فرخ سیر یا محمد شاہ بادشاہ کے دربار سے ان کو حکیم الممالک کا لقب ملا، نتائج الانوار کے مولف

لے مجمع النفائس ص ۲۵۶ لے سرو آزاد قلمی ص ۴۰، ۵۵ ایضاً

محمد تدرت اللہ خاں گویا مومنانے لکھا ہے،

در سرکار محمد اعظم شاہ بقرب طبابت

ملازمت حاصل ساخت و در مراتب تقلم

بلین بلند و فنون طبابت فکر اور چند دانست

پس ازاں در زمان شاہ عالم بہادر شاہ

بہ بیات نمایاں عزت و احترام فراوان

بہم رسانید، و در عهد فرخ سیر بختاب

حکیم الممالک معزز و مہاشی گروید،

سرکار محمد اعظم شاہ کے دربار میں طبیب کی

حیثیت سے ملازم مقرر ہوئے، نظم میں جو

بلین بلند و فنون طبابت فکر اور چند دانست

بہ بیات نمایاں عزت و احترام فراوان

بہم رسانید، و در عهد فرخ سیر بختاب

حکیم الممالک معزز و مہاشی گروید،

کے خطاب سے سرفراز کئے گئے،

صاحب مجمع النفائس نے لکھا ہے کہ شہرت نے شروع میں شیراز میں علوم متداولہ حاصل کئے خصوصاً طب کی تعلیم وہیں حاصل کی،

اداکل در شیراز کتباب فضائل و علوم

خصوصاً نووہ

اداکل عمر میں شیراز میں عام علوم و فنون

خصوصاً طب کی تحصیل کی،

مجمع النفائس اور سفینہ خوشگو دونوں میں منقول ہے کہ ایک دن محمد اعظم شاہ نے کسی طبیب سے مہرہ کی فرمائش کی تھی، صبح کے وقت جب شہرت دربار میں حاضر ہوئے تو شاہزادہ مذکور غلطی سے انہی سے پوچھ بیٹھا کہ کل میں نے جس مہرہ کی فرمائش کی تھی وہ لائے یا نہیں! شہرت نے جواباً شعر عرض کیا

ز غیر مہرہ طلب می کنی بچشم چشم
بن نگاہ غضب می کنی بچشم چشم

نثر عشق کے مولف نے شہرت کے بارے میں ”از کھمے عیسیٰ انقاس شیراز بود“ لکھا ہے، میر غلام علی آزاد نے بھی سرو آزاد میں شہرت کو حکیم کی حیثیت سے بہت سراہا ہے، اور از شعر لے

لے نتائج الانوار مطبوعہ ص ۲۲۶ لے مجمع النفائس قلمی ص ۲۵۶ لے نثر عشق قلمی ص ۲۹۲

درست اندیشہ و اطباء صداقت پیشہ است کے الفاظ سے یاد کیا ہے لکن ہم عصر تذکرہ نگارین دربار
اس خوشگونے حکیم کی حیثیت سے شہرت کی تعریف مندرجہ ذیل عبارت میں کی ہے،

اسی در نبض شناسی سخن یادگار شعر واقع سخن شناسی میں یادگار زمانہ تھا
و حکیم لقب سلف است و در حکمت و حکیم ان کا قدیم لقب ہے، اور وہ حکمت
طبابت بقمان و جالیوس و اطراف طبابت میں لقمان و جالیوس تک کو
باوجود تعلق بہ بی تعلقی محض می گرداند خاطر میں نہیں لاتے تھے، در مختلف طریقوں
و اسامی فیض بخلق خدا می رسانید، سے خلق خدا کی فائدہ پہنچاتے تھے،

صاحب صحف ابراہیم نے بھی شہرت کو ایک ماہر فن طبیب اور بے مثل حکیم کہا ہے،
"خلاصہ حکیم مذکور در فن طبابت بی نظیر خلاصہ یہ ہے کہ وہ فن طبابت میں بے مثال
بود و در علاج مرض اعجاز میسگائی می نمود" تھے اور امراض کے علاج میں اعجاز میسگائی فرماتے تھے،

یہ بیان شہرت کو از اطباء زمان و امرطے والا نشان اسکے نام سے یاد کیا ہے، اسی تذکرہ میں منقول
ہے کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے ان کو حاذق خاں کا خطاب عطا کیا تھا کہ خطاب ان کو فن طبابت میں بدظنی
حاصل ہونے کی وجہ سے ملا تھا،

ہندوستان میں شہرت کی آمد ایسا کہ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے شیخ حسین شہرت شیراز سے ہندوستان آئے
لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ کس بادشاہ کے عہد میں یہاں وارد ہوئے ان کا قلمی دیوان جو خدا بخش خاں کے
کتاب خانہ پٹنہ میں موجود ہے اس کے صفحہ دوم پر شہرت کے حالات زندگی نہایت مختصر دیئے گئے ہیں
یہ حالات محمد بخش خاں غفرلہ کے قلم سے ۱۲۸۰ھ میں مکتوب سولے اسکے مطابق شہرت سلطان محمد بہادر شاہ کے

۱۲۲۱ھ سروانہ قلمی ص ۷۰ سے سفینہ خوشگونہ قلمی ۱۲۹۱ھ صحف ابراہیم قلمی ص ۲۴۲ سے پید بیضا قلمی ص ۱۲۲

عہد دیوان شہرت قلمی کینڈاگ نمبر ۵۰۰ (خدا بخش کتب خانہ، پٹنہ)

کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے، عبارت ملاحظہ ہو۔

گویند اتفاق حسنہ در عہد سلطان محمد بہا کہا جاتا ہے کہ جن اتفاق سے سلطان محمد بہاد
شاہ بہند اتفاقاً و سبحانور شاہ ہزادہ محمد اعظم کے عہد میں شہرت وارد ہند ہوئے اور شاہزاد
شاہ اعتبار پیدا کر دے، محمد اعظم شاہ کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل کیا

اسی کتب خانہ کے انگریزی کینڈاگ جلد سوم ص ۲۰۶ میں تحریر ہے کہ حکیم شیخ حسین شیرازی شہرت تخلص
شہنشاہ اورنگزیب کے عہد سلطنت میں ہندوستان آئے اور اپنے کو شاہزادہ محمد اعظم شاہ کے دربار
سے منسلک کر لیا، اسپرنگ نے بھی اپنے کینڈاگ جلد سوم صفحہ ۱۵۶ میں نقل کیا ہے کہ شہرت اورنگزیب
کے زمانے میں شیراز سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور ۱۱۲۹ھ میں رحلت کی انھوں نے تقریباً پانچ
شہروں کا دیوان یادگار بچھوڑا ہے،

علی دالہ اعلمانی اپنے تذکرہ دریا علی الشعراء جلد دوم قلمی ص ۱۲۱۸ الفہرست میں رقمطراز ہیں کہ شہرت
عالمگیر کے عہد میں شیراز سے ہندوستان تشریف لائے اور شاہزادہ محمد اعظم شاہ کی خدمت میں
زندگی بسر کرنے لگے،

در زمان عالمگیر بادشاہ از شیراز شہرت عہد عالمگیری میں شیراز سے ہندوستان
بہند آمدہ در خدمت شاہزادہ و لاحقاً تشریف لائے اور شاہزادہ محمد اعظم کی
محمد اعظم شاہ ہسرمی برود و سلاطین و خدمت میں گذر بسر کرنے لگے، امراء
امراء مستد در تعظیم و توقیرش باہتمام و سلاطین ان کا بڑا احترام کرتے
می ورزیدند

سفینہ ہندی، صحف ابراہیم اور مغزین الغرائب وغیرہ مختلف تذکروں میں بھی شہرت کی ہندوستان

۱۲۷ سروانہ قلمی ص ۷۰ سے

میں آمد اور انگریز بادشاہ کے عہد حکومت ہی میں تخریب کی گئی ہے، تعجب ہے کہ شہرت کے ہم عصر اور دوست تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی ہندوستان میں آمد کا ذکر اسی طرح کر دیا ہے اور کوئی خاص تاریخ یا سال نہیں لکھا ہے، امر و آواز کے مولف غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ ایران میں نشوونما پائی اور آخر کار ہندوستان اگر فن طبابت کی مدد سے محمد اعظم شاہ کے دربار میں لوگوں کو ہو گئے۔

در ایران نشوونما یافتہ آخر سے ہند
ان کی ایران میں نشوونما ہوئی آخری رات
کیشو در سرکار محمد اعظم شاہ بن خلد کا
میں ہندوستان آئے اور محمد اعظم شاہ کے
دربار میں بحیثیت طبیب ملازم ہوئے

خوشگوار شہرت کیساتھ بیٹھے کا اتفاق اور شاہی درباروں کی شعری نشستوں میں ایک ساتھ شریک ہو کر بحث کرنے کا شرف حاصل ہے، مگر اپنے تذکرہ میں ان کے ہندوستان آنے کا ذکر یوں ہی کرتے ہیں،

وہ ہندوستان پہنچ کر عمر بھر سلطان
محمد اعظم شاہ کی خدمت میں رہے،
وہ ہندوستان رسیدہ خلاصہ عمر در
خدمت بادشاہ زاوہ علیجاہ محمد اعظم شاہ
صرف نمودہ

صاحبین القاسم تخریر فرماتے ہیں:-

ادائل در شیراز فضائل و علوم مخصوصاً
طب نمودہ وارد ہندوستان گشتہ
ادائل عمر میں شیراز سے علوم و کمالات خصوصاً
طب کی تحصیل کر کے ہندوستان آئے،

خود شہرت کے دیوان قلمی سے بھی صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے، کہ وہ عالم شباب میں ایران سے ہندوستان آئے اور ان کے بال سفید ہوئے،

شہرت بیدل ہند آد جمان و میرفت
صبح برد از زنگبار شب ہی روی سفید

لہ سراناد قلمی ص ۶۰ لہ شیراز تخریر قلمی ص ۱۲۱ لہ مجمع القاسم قلمی ص ۲۵۶ لہ دیوان شہرت مخطوطہ ص ۱۳۴ لہ

ماہر پیر از جوانی نیست جز بوسے سفید
صبح می آرد ز ہند شب ہمیں آری سفید
پیری خود را چہاں پوشیدہ دار و کز ہلال
ماہر روی آسمان دیدیم ابروی سفید

سفر حج اور رحلت | شیخ حسین شہرت نے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں حج کا سفر کیا تھا، ان کے معاصر

خوشگوار کا بیان ہے، کہ ایک دفعہ شہرت بہت سخت مرض میں مبتلا ہوئے، چنانچہ انھوں نے منت مانی کہ اگر وہ شفا یاب ہوئے تو خانہ کعبہ کی زیارت کریں گے، اس لئے جب وہ صحت مند ہوئے تو انھوں نے اپنی نذر پوری کرنے کے لئے حج کیا، سفینہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

وقتی بمرض صعب در ماندہ بودند
ایک دن وہ بہت سخت بیمار ہوئے تو نذرانی
نذر کہ دکہ بشرط شفا بطوان حرمین
کہ اگر اللہ تعالیٰ نے صحت بخشی تو حرمین کا
تباد چوں صحت یافت بجا آورد
طواف کریں گے، چنانچہ جب صحت یاب ہوئے

دوسرے تذکروں میں بھی ان کے حج کا ذکر ہے، ان خارجی بیانات کے علاوہ خود شہرت کے کلام سے بھی اس کا داخلی ثبوت ملتا ہے، کہ حج بیت اللہ کی خواہش ان کے دل میں بہت پہلے سے موجود تھی اور وہ اس شرف کو حاصل کرنے کے لئے شروع ہی سے بیقرار تھے، اس ولی تمنا کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں میں اکثر کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں،

کی کشاید جز طواف کعبہ از کارم گره
دیدہ ام من از در دل فوجاب خویش را
جب با وجود کوشش کے شہرت کی یہ تمنا پوری ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوئی تو ان پر یا یوسی اور ضحلا

کی کیفیت طاری ہو گئی، اور انھوں نے اپنی سب سے سخی کا نگلہ مندرجہ ذیل شعر میں کیا،

ز عزم کعبہ منعم میکند سخت سیہ یارب
مرا از راہ حق گمراہی این ہند و بگرد
لیکن شہرت کی قسمت نے جلد ہی یاد دہی کی، اور آخر کار خانہ کعبہ کی زیارت نصیب ہوئی اس مقصد پر

لہ سفینہ خوشگوار قلمی ص ۱۲۱ لہ دیوان شہرت مخطوطہ ص ۱۳۴ لہ ایضاً ص ۱۳۴ لہ

پر انھوں نے اپنی ولی شہرت کا اظہار ان نغظوں میں کیا ہے

شہرت زخدا غن بنی خواستہ بودم صد شکر کہ حق آنچه دلم خواست بہاں کرد
ریاض الشعراء کے مولف کے قول کے مطابق شہرت نے کبھی کا یہ سعادت اثر سفر اپنی زندگی کے آخری

مرحلوں میں کیا تھا، اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد وہ پھر ہندوستان لوٹ آئے، یہ

دور اواخر عمر برہمنوفا قائد توفیق آخری عمر میں جہاز کے مفکر سفر کی سعادت اور

عزیت سفر سعادت اثر جہاز نمودہ توفیق میسر آئی اور مکہ مکرمہ و مدینہ

بزیارت حرمین شریفین مشرف ہوئے اور حجت منورہ کی زیارت سے مشرف ہو کر

ہند نمودہ ہندوستان واپس آئے،

حج سے واپس ہونے کے بعد شہرت کی سوت شاہی دربار میں اور بھی بڑھ گئی، میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ حج تہجد کے بعد شہرت کو محمد شاہ کے دربار سے چار ہزاری منصب ملا اور اس طرح ان کی عزت و شہرت چارم آسمان پر پہنچ گئی،

و بعد ادا سے مناسک بدرگاہ خلافت مناسک حج ادا کر کے دربار خلافت میں اپنی

معاودت نمود و بہ منصب چہار ہزاری لہے اور منصب چہار ہزاری پر فائز ہوئے اور

سرا تقیار بر فلک چہارم رسانیدہ اپنی عزت شہرت فلک چہارم پر پہنچا دی،

”یہ بیضا“ میں بھی تحریر کیا ہے کہ سفر حج سے واپسی کے بعد ہی شہرت کو چار ہزاری منصب محمد شاہ کے دربار سے ملا، اور وہ اس اعزاز کی عمدہ پر کچھ دنوں تک فائز رہے، یہاں تک کہ ماہ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ میں وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے،

و چند ہی با آن حال گذریند تا آنکہ کچھ عرصے تک اس حال رہا چہار ہزاری

لہ دیوان شہرت نغظہ تلک الف، لہ ریاض الشعراء قلمی جلد اول ص ۲۱۹ لہ سرد آزاد قلمی ص ۷۰

در شہر ذی الحجہ سنہ یک ہزار و یکصد

یہاں کہ در ماہ ذی الحجہ ۱۱۲۹ھ میں

و چہل و نہ ازین خاکدان در گذشتہ

در عالم جادو دانی ہوئے،

صاحب مجمع النفائس نے لکھا ہے کہ شہرت کی موت محمد شاہ بادشاہ کے جلوس کے چوتھے یا پانچویں سال میں واقع ہوئی، ملاحظہ ہو،

در سنہ چہار پانچ فردوس آردنگاہ

محمد شاہ کے چوتھے یا پانچویں سنہ جلوس

بوجہ حق پیوستہ

میں وہ رحمت حق سے واصل ہوئے،

خوشگونی بھی شہرت کی تاریخ وفات ۱۱۲۹ھ لکھی ہے جیسا کہ کہتے ہیں یہ

در سال ہزار و صد و چہل و نہم عزم سیر

۱۱۲۹ھ میں عالم جادو دانی کا قصد کیا

آن جہانی فرمود فقیر تاریخ شہرت

خوشگونی شہرت مرد سے ان کی

مرد یافتہ،

تاریخ وفات نکالی،

سرد آزاد کے مولف میر غلام علی آزاد نے لکھا ہے کہ شہرت کی وفات شاہجہان آباد میں ۱۱۲۹ھ میں واقع ہوئی،

وفاتش در شاہجہان آباد ماہ ذی الحجہ

ان کی وفات شاہجہان آباد میں ذی الحجہ

سنہ تسع و اربعین و مائتہ و اربع

۱۱۲۹ھ میں ہوئی راقم نے تاریخ وفات

(۱۱۲۹) اتفاقاً افتاد و تحریر بطور گوید

یوں کہی ہے،

بے نظیر زمانہ شیخ حسین،

گوئی معنی ز نکتہ بہناں برد

ہفتے از ہزارے رحلت اور

سال تاریخ گنفت شہرت مرد

۱۱۲۹ھ

لہ ریاض القلمی ص ۱۲۲، لہ مجمع النفائس قلمی ص ۲۵۶ لہ سفینہ خوشگونی ص ۱۲۹

لہ سرد آزاد قلمی ص ۷۰

شیخ مبارک کی تفسیر کا قلمی نسخہ

از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی بیکھڑا شعبہ اسلامیات، علم یونیورسٹی علی گڑھ

لوگ عام طور سے شیخ مبارک کو ابو الفضل اور فضلی کے والد کی حیثیت سے جانتے ہیں، ابو الفضل اور فضلی کی شہرت سے انکار نہیں تو اپنے خصائص کی بنا پر تاریخ ہند میں بہت مشہور ہیں اور اکبر کے نام کے ساتھ ان کا نام وابستہ ہے، لیکن شیخ مبارک خود صاحب فضل و کمال ہیں اور اپنے علمی کمالات کی بنا پر اہل علم کے حلقہ میں معروف و مشہور ہیں تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے حالات بیان کئے ہیں اور ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ عبدالقادر بدایونی نے اکبری دور پر سخت تنقید کی ہے، اور فیض و ابو الفضل کی روش پر بہت اعتراض کئے ہیں، شیخ مبارک بھی ان کی زد سے محفوظ نہیں ہیں، انہوں نے ان کے طرز عمل اور حکمت عملی کی مخالفت کی ہے، مگر بایں ہمہ ان کے علم و فضل کے معترف ہیں، ان کے الفاظ ہیں:

از علمائے کبار روزگار است و دور	وقت کے علمائے کبار سے تھے اور اب تک
صلاح و تقویٰ و توکل ممتاز بنائے زمان	زمان اور خلائق دوران کے درمیان
و خلائق دوران است	صلاح و تقویٰ اور توکل میں ممتاز تھے،

وہ تمام علوم و فنون میں ستگاہ کامل رکھتے تھے تصوف سے بھی خوب واقف تھے، قرآن مجید کے

حافظ اور قرأت میں جہالت تامہ رکھتے تھے، حفظ کا یہ حال تھا کہ قرأت عشرہ میں سے ہر قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھتے تھے، تفسیروں پر خاص نظر تھی اور علوم قرآنی سے بہت اچھی طرح واقف تھے، علامہ قدوائی نے اپنی کتاب میں ان کی ایک ضخیم تفسیر کا ذکر کیا ہے، اس میں اس زمانہ میں ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیروں پر کام کر رہا تھا، اس وقت مجھے شیخ مبارک کی تفسیر کی خاص طور سے تماشائی تھی کہ اکثر زبیر صاحب کی کتاب کنز الیوشن آف انڈیا ٹو ایک لٹریچر میں اس کا ذکر ملا، مگر اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی گئی تھی کہ اب کہیں اس کا وجود نہیں ہے، حکیم سید عبدالحمید صاحب نے اشفاق الاسلامیہ فی الہند میں اس کا ذکر کیا ہے، مگر پتہ نہیں دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منتخب التواریخ ہی کا بیان نقل کر دیا ہے، منتخب الباب اور آثار الکریم نے بھی یہی کیا ہے، غالباً ان لوگوں کی نظر سے یہ تفسیر نہیں گذری ہے، مشہور کتب خانوں کی فہرستوں سے بھی کچھ پتہ نہیں چلا اور مجھے بھی یہ خیال ہونے لگا کہ شاید یہ کتاب ضائع ہو گئی، لیکن شیخ مبارک کے علمی کمالات کی بناء پر آرزو تھی کہ یہ کتاب کہیں مل جائے، بہر حال آس اور یاس کے درمیان میری تلاش جاری رہی، خیال ہوا کہ شاید کسی ذاتی کتب خانہ میں یہ گمشدہ تفسیر مل جائے، خدا کا شکر ہے کہ میرا یہ خیال صحیح ثابت ہوا اور مجھے لکھنؤ میں سید تقی صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں اس کی پانچ جلدیں دستیاب ہو گئیں، شیخ مبارک پر جہاں اور الزامات لگائے گئے ہیں، وہیں ایک الزام شیعیت کا بھی لگایا گیا، انہوں نے اپنی ایک لڑکی کی شادی خداوند خان دکنی کے ساتھ کر دی تھی، خداوند خان شیعہ تھا، اس بنا پر مخالفین نے شیخ مبارک کو بھی شیعہ قرار دیا، لیکن اگر شیعہ ہونے کا یہ معیار مقرر کر لیا جائے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں سنی شیعہ قرار پائیں گے، کیونکہ صدیوں سے اس طرح کی رشتہ داریاں رائج رہی ہیں، لیکن شیعیت کی اس تشہیر کی بنا پر اس کتاب کی حفاظت کا انتظام ہو گیا، اور بعض علم دوست شیعوں نے اسے اپنے کتب خانہ میں

محفوظ رکھا، اس کا مختصر ذکر اس قلمی نسخہ پر درج ہے،

ملا عبد القادر نے کتاب کا نام بیخ نفائس ایمن لکھا ہے، اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اسی کو نقل کر دیا ہے، لیکن اس قلمی نسخہ میں بیخ ایمن المعانی و مطلع ثبوس المثنائی لکھا ہوا ہے، ملا عبد القادر نے چار ضخیم جلدیں بیان کی ہیں اگر یہ موجودہ نسخہ جو جھگڑا دستیاب ہوا، پانچ جلدوں میں منقسم ہے، اور ایک جلد غائب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ چوتھی جلد سورہ کسف پر ختم ہوتی ہے اور پانچویں کا آغاز سورہ یسین سے ہوتا ہے اس طرح پانچ پاروں سے زیادہ کی تفسیر درمیان سے غائب ہے، پہلی جلد کے شروع کے اور پانچویں جلد کے آخر کے چند اوراق بھی موجود نہیں ہیں، اس کی کا ذکر اپنی کتاب رہنموتانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، میں کیا گیا ہے جو مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے

مصنف نے اس تفسیر کے لکھے جانے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے اس کی بعض اہم اور نمایاں خصوصیت بھی بیان کی ہیں جو یہ ہیں۔

”اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد سے میرے گھر میں ایک کتب خانہ جمع ہو گیا ہے جو تقریباً تین ہزار کتابوں پر مشتمل ہے، اکثر کتابیں نہایت قدیم مگر اچھی حالت میں اور صحیح لکھی ہوئی ہیں، اور یہ اساتذہ فن کے سامنے پر بھیجا چکا ہیں، بعض نئے خود مصنفین کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض جو دوسرے قدیم لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں خصوصیت سے نہایت اہم ہیں، ان آثارِ قدیمہ اور علمی نواد کی وجہ سے کتب خانہ کا اعتبار بہت بڑھ گیا ہے، پانچ سو سے زیادہ کتابیں میں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں تاکہ بچے اس کا ثواب لیں اور میرے علم میں اضافہ ہو علاوہ ازیں صحیح لکھے دئے کتابوں کا فقدان ہے، اکثر کتابیں الفاظ و کلمات میں ہیر پھیر کر کے کتابیں مسخ کر دیتے ہیں، اس شان لوگوں کی اصلاح کرے، جب سلطان عادل رالہ

تعالیٰ ان کا عمر و اقدار میں برکت دے، بعض شمالی شہروں کی فتح و تسخیر کی جانب متوجہ ہوتے اور ان کا لالہ اور میں قیام دیر پا ہوا تو میں بھی ان کی دعوت پر اس شہر میں پہنچا اور مجھے یہاں سکون اور تمنا ملی تھی یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری میں اس کا بچہ پر خاص فضل و کرم ہوا ہے، قریب ختم ہونے کو آئی، تو میرے دل میں اس لئے اچانک یہ خیال ڈالا کہ ایک ایسا جامع تفسیر لکھوں جو ظاہری و باطنی خصوصیات سے آراستہ، تشکیک و شبہات سے خالی، صحیح اور مستند اقوال و آثار کا مجموعہ، حقائق و اسرار سے معمور اور سلسلے سے واضح و جاد اور لطیف اشارات پر مشتمل ہو تاکہ یہ میری جانب سے میری اولاد و اخلاف کے لئے یاد دہانی اور قرآنی مطالب کو حل کرنے میں تمام ذی استعداد لوگوں کے لئے موجب بصیرت ہو۔“

ہے، چنانچہ لکھے ہیں:-

”میں اس کتاب میں نظم قرآن کے وجوہ اور دسوں متواتر قراءتوں کے علاوہ اوقات آیات کے فضل اور معانی کے ان طریق کا ذکر کروں گا، جو میرے نزدیک علماء و سخن اصحاب کشف و عرفان اور اہل عقل و حکمت سے ثابت و محقق ہیں، میں جلوں کے ربط اور آیات و سورتوں کی مناسبت بھی واضح کروں گا، اور انبیاء علیہم السلام کے قصوں اور گذشتہ قوموں کے واقعات پر بھی روشنی ڈالوں گا، شان نزول اور ناسخ و منسوخ کے اسباب اور ہر سورہ کے اختتام کی وجہ بیان کر کے دکھاؤں گا کہ اس مخصوص آیت پر یہ سورہ کیوں ختم ہوئی پھر ہر سورہ کی آیتوں اور ان کے حروف و الفاظ کی تعداد بیان کر دوں گا اور اسی ضمن میں وہ رموز و اسرار بھی واضح کئے جائیں گے جن کو حروف و اوقات اور اعداد کے جانتے والوں نے اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے، اور ہر سورہ کے شروع ہی میں اجمالاً اس کے معنی

کا خلاصہ دیدوں گا، اور پھر بشرط گنجائش آیات کے ضمن میں مزید تفصیلات قلمبند کروں گا۔
ان دونوں اقتباسات سے اس تفسیر کی اہمیت اور قدر و قیمت کا پوری طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد کے مباحث کا اجمالی تعارف اور خلاصہ راقم اپنی کتاب میں پیش کر چکا ہے، اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں،

معارف کی رسائی علمی حلقوں میں بہت ہے، اس بنا پر یہ چند سطور اس میں لکھ رہا ہوں تاکہ میرے ساتھ دوسرے اہل علم بھی اس کی تلاش میں لگ جائیں، ممکن ہے کتاب کا کوئی اس سے بہتر اور مکمل نسخہ دستیاب ہو جائے اور کسی علمی ادارہ کو اس کی اشاعت کا خیال ہو جائے اس طرح ایک اہم علمی ورثہ ضائع ہونے سے بچ جائیگا، اور ایک نامور ہندوستانی عالم کی تصنیف محفوظ ہو جائے گی، میں نے ابھی حال میں سید تقی صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں جا کر پھر اس کتاب کو دیکھا اور یہ محسوس ہوا کہ یہ قیمتی نسخہ خراب ہوتا جا رہا ہے، شخصی کتب خانوں میں کتابوں کی حفاظت کا انتظام یوں بھی زیادہ اچھا نہیں ہو پاتا پھر جب کتب خانہ کے مالک کی مالی حالت زیادہ بہتر نہ ہو تو حفاظت کی سہولتی تدبیر بھی دشوار ہوتی ہے، سید تقی صاحب مرحوم کا کتب خانہ بھی مالی دشواریوں میں مبتلا ہے اور کتابوں کی حفاظت کے ترقی یافتہ وسائل سے کام لینا اسکے بس میں نہیں ہے، شخصی کتب خانوں میں بہت سے جو اہل گراں مایہ موجود ہیں، حکومت کی امداد کے بغیر ان کی خاطر خواہ حفاظت ممکن نہیں ہے امید ہے کہ صاحبِ اصحاب اس جانب متوجہ ہوں گے،

انمولہ کتاب اول

حضرات صحابہؓ خدا کی عین کے مقام، عبادت، معاملات اور اخلاق کا ایمان افروز مرقع، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم (جدید ڈیشن) قیمت ۲۰-۹ روپیہ پیچر

مطبوعات جدیدہ

تاریخ فرخ سیرا وائل عہد محمد شاہ مرتبہ پروفیسر سید حسن عسکری صاحب، متوسط تقطیع
معروف بہ شاہنامہ منور کلام کاغذ متوسط، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۴۰،

جلد مع گرد پوش قیمت ۱۰ روپیہ، اقبال بک ڈپو پٹنہ-۴۴

یہ فرخ سیر کے زمانے کے ایک صاحب کمال منشی شیوہ اس مکتوی کی تصنیف ہے اس

میں فرخ سیر کے علاوہ محمد شاہ کے بھی ابتدائی دور حکومت کے واقعات درج ہیں، پروفیسر سید حسن

عسکری کو اس کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم سے ملا تھا، اب انھوں

نے حیدرآباد لندن اور علی گڑھ کے نسخوں سے مقابلہ کر کے اسے شائع کیا ہے، اور ایک مختصر ڈیبا

میں کتاب و مصنف نیز قلمی نسخوں کے بارہ میں ضروری معلومات تحریر کئے ہیں اور برٹش میوزیم

لندن اور کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کے نسخوں میں جو فرق اور اختلاف ہے اسے بھی واضح کیا

ہے، مگر تذکروں میں مصنف کے حالات نہ ملنے کی وجہ سے ان کے سوانح حیات نہیں تحریر کئے جاسکتے

ہیں، لیکن پتہ نہیں ملنے کی وضاحت طلب باتوں کی تشریح کے لئے حواشی کیوں نہیں لکھے گئے، یہ

کتاب فرخ سیر کے ہفت سالہ اور محمد شاہ کے ابتدائی چار سالہ دور حکومت کے حالات و واقعات

کے لئے ایک اچھا ماخذ ہے، عسکری صاحب نے اس تاریخی دستاویز کو شائع کر کے ایک مفید علمی خدمت

انجام دی ہے،

حضرت شاہ عیسیٰ حیدرآباد، مرتبہ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب تقطیع خورد، کاغذ بہتر کتابت

دباعت قدرے بہتر صفحات ۱۸۲، قیمت پچیس روپے نیشنل فائونڈیشن پر ننگ پریس جیدو آادہ
 حضرت شاہ عیسیٰ جندابا ندویوں و گیارہویں صدی ہجری کے ایک صاحب سلوک ارشاد
 بزرگ تھے، ان کے آباء و اجداد کا وطن سندھ تھا، مگر وہ اپنے بعض اہل خاندان کے ہمراہ دکن چلے
 آئے اور برہان پور میں بود و باش اختیار کی، زیر نظر کتاب ان کے حالات و کمالات پر مشتمل ہے یہ
 دراصل لائق مصنف کے تحقیقی مقالہ فارسی ادب کے ارتقا میں برہان پور کا حصہ، کا ایک باب ہے
 اس کے شروع میں حضرت شاہ عیسیٰ کے خاندانی و ذاتی حالات، تصوف میں کمال اور اولاد و مریدان
 کا ذکر کیا گیا ہے، اور آخر میں انکی تصنیفات، تشریحیں، کلام و دیگر فنون کلام دیا گیا ہے، غالباً مصنف کو شاہ عیسیٰ کی کتابوں
 کے نسخے دستیاب نہیں ہو سکے اس لئے عین المعانی کی طرح نہ دوسری کتابوں کا مفصل ذکر ہے اور
 نہ ان کی تعلیمات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، کتاب میں جن غیر معروف جگہوں کے نام آئے
 ہیں، اگر ان کی مختصر وضاحت کر دی گئی ہوتی تو قارئین کو زیادہ سہولت ہو جاتی، عربی عباراتوں
 کی نقل میں صحت کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا ہے، ان امور سے قطع نظر کتاب محنت و تحقیق سے
 لکھی گئی ہے،

نکاح و سفاح، از جناب سید حسن رضا ہاشمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و

طباعت معمولی صفحات ۳۲۸، قیمت پچیس روپے، ایکرا د بکڈپو، جوادیہ عربی کالج

پرہلا و گھاٹ، بنارس،

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، اس کا پہلا حصہ ابھی شائع نہیں ہو سکا ہے، اس دوسرے
 حصہ میں سفاح کی حقیقت بیان کی گئی ہے، اور یہ نو ایوب پر مشتمل ہے، مصنف نے سفاح، زنا
 اور فحشا کی لغوی تشریح، ان کے قرآنی استعمالات اور ان کی مذہبی، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی
 تمدنی اور طبی حیثیت سے قباحت و شناخت دکھائی ہے، ایک باب میں زنا کاری کے اسباب و

و حکمت بیان کرتے ہوئے مغربی و مشرقی ملکوں میں اس کے فروغ کی مثالیں اعداد و شمار کے
 ذریعہ پیش کی گئی ہیں، آخر میں ان تدبیروں کا ذکر ہے جو بدکاری کے سدباب کے لئے اسلام نے اختیار
 کی ہیں، اسی ضمن میں نکاح، لباس، پردہ اور تعزیری حدود و جرائم، جلد اور قذت وغیرہ کی مختلف پہلوؤں
 سے غرض و حکمت بیان کر کے ان کے بارہ میں اعتراضات و شبہات کا جواب دیا گیا ہے، لائق مصنف نے
 اپنے خاص فرقہ کے بجائے بڑی حد تک اصل اسلامی نقطہ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ۱۳۲۱
 پر حضرت عمر کے عہد خلافت کے ایک واقعہ کے ذکر میں تپہ نہیں کیوں ان کا نام نہیں تحریر کیا گیا ہے
 سونہ احزاب کی آیت میں اہل بیت سے ازدواج منہیات کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کی صرف بعض اولاد کو مراد لیا گیا ہے، اسلامی احکام و قوانین کے سلسلہ میں مسلمان حکمرانوں کے طریق
 سے استدلال کا مناسب ہے، تزکیہ کو عفت اور فحشا کو زنا کا بالکل ہم معنی قرار دینا صحیح نہیں ہے اور
 نہ یہ درست ہے کہ قرآن میں ہر جگہ فحشا و اور فاحشہ کو زنا کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، الا
 نظر منہائے استدلال غلط ہے کہ عورت گھر کے باہر اپنے جسم کے بعض اعضاء کو کھلا رکھ سکتی ہے
 کیونکہ قرآن نے پردہ کے احکام دو جگہ بیان کئے ہیں، ایک جگہ گھر کے باہر کے پردہ کا ذکر ہے، اور
 دوسری جگہ گھر کے اندر اور محرم لوگوں سے پردہ کا ذکر ہے، اولانا نظر منہا کا تعلق اسی دوسری صورت سے
 ہے، ایک جگہ لکھا گیا ہے، کہ حضرت آدم کو جس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا، وہ بنی آخر الزما
 تھے، معلوم نہیں اس کا منشا کیا ہے، قصہ کہانی کی کتابوں کی طرح مصنف نے بھی حضرت یوسفؑ

کو درغلادالی عورت کا نام زینب لکھ دیا ہے، کہیں کہیں تکرار اور طوالت بھی پائی جاتی ہے، یہ نوجوان مصنف
 کی پہلی کتاب ہے، اس لئے خیالات اور طرز ادا دونوں میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں، تاہم
 انہوں نے اس کو غور و فکر، محنت اور بڑے نیک جذبہ سے لکھا ہے، اور وہ حوصلہ افزائی
 کے مستحق ہیں، آخر میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین کی ایک تعارفی تحریر بھی شامل ہے

نوجوانوں سے خطاب، مرتبہ جناب اسد اللہ خان صاحب علیگ، تقطیع خورد، کاغذ

کتاب و طباعت بہتر صفحات ۳۰۱ جلد، قیمت سے ریپہ ۱۰ روپے، سالانہ خان پور میونسپل کورپوریشن

زیر نظر کتاب میں جوانوں کے لئے طبی ہدایتیں تحریر کی گئی ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ سن بلوغ کے بعد سے
اں باپ بنے تک کی زندگی میں انکا کیا طور طریقہ ہونا چاہئے پہلے اس زمانہ کی زندگی کو خراب اثرات اور بے اول
سے بچنے کا ذکر ہے پھر مختلف حیثیتوں سے شادی کی ضرورت، اسکی عمر کی تعیین، تجدید و افزائش نسل میں رکھی
بچوں کی پرورش و رضاعت کے طریقے اور ان کو بیماریوں سے بچانے کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، مصنف ہر
ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں، اسلئے ان کے اکثر مشورے مفید ہیں لیکن ان کی بعض باتوں میں تضاد ہے جیسے
ایک جگہ مردوں کی شادی کے لئے مناسب عمر چالیس سال اور عورتوں کے لئے ۲۵ سال تحریر کی ہے
مگر دوسری جگہوں پر اس سے مختلف باتیں لکھی ہیں، عمر کی تعیین کے لئے طبی، اقتصادی اور معاشرتی
حیثیت سے جو دلائل بیان کی ہیں وہ ممکن ہے صحیح ہوں، مگر قرآن مجید سے استدلال مضحکہ خیز ہے ای
طرح ایک جگہ غنط تولید کی حمایت اور دوسری جگہ اسکی تردید اور افزائش نسل کے سلسلہ کی حد میں درج کی گئی
ہیں مثلاً ۲۲ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہدایت بزرگان دین کی طرف منسوب کر دی گئی ہے،

اعجاز تسکین، از جناب منظور نسکین صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتاب، طباعت عمدہ صفحات ۴۴۴ جلد

مع خوبصورت گروپوش قیمت لہجہ چھاپہ ہرچ اسٹور گلگول بازار، ڈاکخانہ گلگول، پٹنہ،

یہ جناب منظور نسکین صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہے، ان کو تعزل سے زیادہ مناسبت ہے اس مجموعہ
کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، آخر میں چند نظیوں، قطعات اور رباعیات بھی درج ہیں، مصنف کو تعزل کی
قدیم روایات اور قدیم عربیوں میں، تاہم اس پرانی زمین میں بھی کہیں نئے نئے گل بوئے نظر آتے ہیں
نظروں اور قطعات میں موجودہ حالات کی عکاسی زیادہ کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے تسکین صاحب
کے کلام میں لطافت بھی ہے اور جوش بیان بھی

جلد ۱۱۷ ماہ مارچ ۱۹۶۶ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ عدد ۳

مضامین

تذرات

شید صاحب الدین عبدالرحمن ۱۶۲-۱۶۳

مقالات

اقبال: اسلام اور اشتراکیت

جناب گلن آتھ آزاد صاحب کشمیر ۱۶۵-۱۸۶

عمید لویکی

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ۱۸۶-۲۰۸

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پاکستان میں چار مہینے

شید صاحب الدین عبدالرحمن، ۲۰۹-۲۲۸

ذمیتا

مولانا عبدالباری ندوی

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔ اے ۲۲۹-۲۳۲

ادبیات

نعت

جناب چودھری پریشان شکر سردس انادی

۲۳۳-۲۳۴ ایڈووکیٹ اناؤ،

۲۳۵-۲۴۰ "ض"

مطبوعات جدیدہ

.....